خطاب بہ جوانان اسلام

ماضی کی روشنی، مستقبل کی اُڑان

حسنین عباس

اقبال اکادمی پاکستان

اس کتاب کی اشاعت قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن کے خصوصی مالی تعاون سے ہوئی

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

ڈاکٹر عبد الرؤف رفیقی

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

حکومت پاکستان

قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن

چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور
Tel: [+92-42] 36314510, 99203573
Fax: [+92-42] 36314496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-634-6

طبع اوّل	:	۲۰۲۵ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۶۵۰ روپے
مطبع	:	ملک سراج الدین اینڈ سنز، لاہور

محل فروخت: سیلز آفس، گراؤنڈ فلور، سروسز بلاک، ایوانِ اقبال کمپلیکس، لاہور

فہرست

خطاب بہ جوانانِ اسلام ۵

پیش لفظ ۷

ابتدائیہ ۹

۱۔ وہ کیا گردوں تھا ۱۳

۲۔ تاج سر دارا ۱۹

۳۔ تمدن آفریں ۴۴

مسلمانوں کی سائنسی ترقی کی عالمگیر اہمیت ۷۰

مسلمانوں کا اصول انسانیت نوازی ۷۷

۴۔ الفقر فخری ۸۲

۶۔ بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبارا ۸۷

۷۔ جہاں گیری و جہاں داری ۹۰

۸۔ جہاں آرائی ۱۰۳

جدید دنیا مسلمانوں کی جہاں آرائی کی رہین ۱۰۵

۹۔ گفتار و کردار ۱۰۸

مسلمانوں کی علمی فتوحات ۱۱۷

۱۰۔ اسلاف کی میراث ۱۲۶

۱۱۔ علم کے موتی ۱۴۲

۱۲۔ثُریّا ۱۴۵
۱۳۔نوردیدہ اش ۱۵۵
اختتامیہ ۱۵۷
مصادر و مراجع ۱۵۹
اردو کتب ۱۵۹
English Books 161

خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردُوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹُوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبّت میں
کُچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدّن آفریں، خلاّقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں 'الفقرَ و فَخرِی' کا رہا شانِ امارت میں
"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت رُوے زیبا را"
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ مُنعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض مَیں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیّل سے فزوں تر ہے وہ نظّارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تُو گُفتار وہ کردار، تُو ثابت وہ سیّارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

ثُریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلَّم سے کوئی چارا
مگر وہ عِلم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
"غنیؔ! روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کُن
کہ نُورِ دیدہ اش روشن کُند چشمِ زلیخا را"

پیش لفظ

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ملت اسلامیہ کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکی اور خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری کا جذبہ پیدا کیا۔ جب مسلمانوں کی پسماندگی اور بے عملی نے ان کی عظمت کو ماند کر دیا تھا، علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ان میں نئی زندگی کا شعور پیدا کیا اور انہیں اپنے عروج کی راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال کا پیغام صرف شاعری کا اظہار نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی کی عظمت اور موجودہ کمزوریوں کا شعور دیتے ہوئے ایک نیا عزم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں تمام مسلم طبقات کو مخاطب بنایا، مگر ان کی سب سے زیادہ توجہ نوجوانوں پر مرکوز تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ نوجوان قوم کی طاقت اور مستقبل کی بنیاد ہیں۔ اس لئے اقبال نے اپنی نظموں میں نوجوانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مشہور نظم "خطاب بہ جوانان اسلام" اسی نوعیت کی ایک نظم ہے، جس نے نوجوانوں کو اپنی حقیقت، طاقت اور منصب کا شعور دیا۔

یہ نظم مختصر ہونے کے باوجود نہ صرف نوجوانوں کو ان کے ماضی اور حال کا شعور دیتی ہے بلکہ ان کے لیے ایک روشن اور کامیاب مستقبل کے لئے تحریک بھی فراہم کرتی ہے۔ اقبال کا مقصد نوجوانوں کو صرف شاعری کا جمالیاتی پہلو دکھانا نہیں تھا بلکہ انہیں حقیقت کا شعور دلا کر ان کے اندر تبدیلی لانے کی جدوجہد کرنا تھا۔ علامہ اقبال نے نوجوانوں میں اسلام کے سنہری دور کی عظمت اور شان و شوکت کا شعور اجاگر کیا۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمان علم و حکمت کے ذریعے دنیا میں بلند مقام حاصل کر چکے تھے اور یہ تسلیم شدہ حقیقت تھی کہ غیر مسلم بھی مسلمانوں کے علم و حکمت کے معترف تھے۔ اقبال کا پیغام یہ تھا کہ مسلمان اپنے عروج کے دور کو یاد کریں اور اسی جذبے کے ساتھ آج کے مسائل کا حل تلاش کریں۔

علامہ اقبال نے نوجوانوں کو یہ بھی بتایا کہ اسلام کی عظمت صرف ظاہری طاقت میں نہیں تھی بلکہ اس کی اصل طاقت اس کی علمی اور اخلاقی اقدار میں تھی۔ نوجوانوں کو اپنی فکری، ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو مضبوط کرنا ہو گا تاکہ وہ اسلامی تہذیب کے عظیم ورثے کو دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

اس کتاب کا مقصد علامہ اقبال کے اس پیغام کو بہتر طور پر سمجھنا ہے کہ نوجوان مسلمان کس طرح اپنی تاریخ، تہذیب اور علم کی روشنی سے اپنے حال کو بہتر بنا سکتے ہیں اور عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب میں "خطاب بہ جوانان اسلام" کی تلمیحات، استعارات اور رموز کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ علامہ اقبال کے پیغام کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکے اور اس پر عمل کیا جا سکے۔

ابتدائیہ

علامہ اقبال کی شاعری نے مسلمانان برصغیر میں انگریزوں کی غلامی سے نجات کا جذبہ پیدا کیا۔ علامہ اقبال کا کلام جہاں ملت اسلامیہ کو ماضی کی شاندار روایات سے وابستہ کرتا ہے، اس میں مستقبل کی تعمیر کی امنگ بھی بیدار کرتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں اجتماعی بیداری پیدا کرنے اور بے عملی کے رویے کا خاتمہ کرنے میں علامہ اقبال کی شاعری نے ایک روحانی محرک کا کردار ادا کیا۔ اگرچہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں ملت اسلامیہ کے تمام طبقات کو اپنا مخاطب بنایا لیکن ان کی توجہ کا سب سے زیادہ مرکز نوجوان رہے۔ نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فارسی اور اردو میں کئی نظمیں لکھیں۔ بانگ درا کی نظم "خطاب بہ جوانان اسلام" اسی نوعیت کی ایک نظم ہے۔ نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے لکھی جانے والی نظموں میں یہ نظم نہ صرف بہت زیادہ مقبول ہوئی بلکہ مختصر ہونے کے باوجود نوجوانوں کو ان کے ماضی اور حال دونوں کا شعور دیتی ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے نوجوانوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اپنے حقیقی منصب کو پہچانیں کہ وہ کتنی عظیم تہذیب کے وارث ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی اس نظم کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> "اس نظم میں علامہ نے مسلم نوجوانوں کو اپنے اسلاف کے سوانح، عظمتوں اور دوسرے عظیم کارناموں سے اپنی حالت کا موازنہ اور مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس دعوت میں ایک طرح سے انہیں عزم و عمل اور سعی و کوشش کا درس دیا گیا ہے۔ اس کی رغبت دلائی گئی ہے۔"[1]

---

[1] یزدانی، ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید، شرح بانگ درا (لغت و تشریح)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۱۵۔

علامہ اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۴ء میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ایم، اے، او کالج علی گڑھ کے سالانہ اجلاس میں دعوتِ شمولیت کے جواب میں مولانا شوکت علی کے نام خط میں لکھی۔ علامہ اقبال نے اس اجلاس میں شمولیت سے معذرت کرتے ہوئے لکھا:

''بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے اس بد تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چار دیواری کو کشتیِ نوح سمجھتا ہے دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ روٹی کھانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہیے۔ مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقات ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ یہ چند اشعار میری طرف سے ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے۔''[1]

اس کے بعد خط میں علامہ اقبال نے نظم 'خطاب بہ جوانان اسلام' کے اشعار لکھ دیئے۔

غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''یہ ایک قطعہ ہے جو بعض دوسرے قطعات اور اشعار کے ساتھ ۱۹۱۴ء میں یعنی "شمع اور شاعر" کے دو سال بعد انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ اس سال جلسہ اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں حبیبیہ ہال کے عین سامنے منعقد ہوا تھا۔ اقبال نے اس کے لیے کوئی خاص نظم نہ لکھی تھی۔ آخری وقت میں انجمن کے کارکنوں کی طرف سے شدید اصرار ہوا تو متفرق چیزیں پڑھ دیں۔ ان میں ایک یہ قطعہ بھی تھا۔ گویا یہ "شمع اور شاعر" سے پہلے لکھا گیا۔ اگرچہ مدت بعد پڑھا گیا۔''[2]

یہ نظم اگرچہ اپنی نوعیت میں مختصر ہے، لیکن اس میں ملت اسلامیہ کے ماضی، حال اور مستقبل کا جامع اور گہرا احاطہ کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس نظم کے ذریعے اسلامی نوجوانوں

---

[1] شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۵ – ۲۲۷؛ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ج ا، ص ۳۲۹۔

[2] غلام رسول مہر، مطالب بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۲۹

کو ان کے عظیم اور شاندار ماضی سے روشناس کرایا، ساتھ ہی ان کی موجودہ دگرگوں حالت کی نشاندہی بھی کی اور انہیں ایک روشن، کامیاب اور فلاحی مستقبل کی تعمیر کی ترغیب دی۔ اقبال کا مقصد صرف ایک شاعرانہ اظہار نہیں تھا، بلکہ وہ نوجوانوں کو ان کے حقیقی مقام اور طاقت کا شعور دلانا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے عمل اور سوچ میں انقلاب لائیں۔

اس نظم کے اختصار کے باوجود، علامہ اقبال کے پیغام کی گہرائی اور وسعت ان استعارات، تلمیحات اور رموز میں پوشیدہ ہے جو اس میں استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ اشعار محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک گہرا فکری اور فلسفیانہ پیغام رکھتے ہیں، جو ملت اسلامیہ کی موجودہ پوزیشن، اس کی ممکنہ ترقی اور کامیابی کے راستوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

اس نظم کی حقیقی تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب ان استعارات اور اشارات کو ان کے تاریخی، ثقافتی اور معنوی پس منظر میں سمجھا جائے۔ ان تلمیحات میں جو گہرائی اور پیچیدگیاں چھپی ہوئی ہیں، ان کے ذریعے علامہ اقبال نہ صرف مسلمانوں کی موجودہ حالت کا تجزیہ کرتے ہیں بلکہ انہیں ایک نیا وژن اور تحریک دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس نظم میں استعمال ہونے والے ہر لفظ اور ہر علامت کو صحیح تناظر میں سمجھیں تاکہ اقبال کے پیغام کو بھرپور طور پر محسوس اور اپنانا ممکن ہو۔ لہٰذا، اس کتاب میں اس نظم کی اہم تلمیحات اور اشارات کی وضاحت کی جارہی ہے تاکہ اقبال کے پیغام کی حقیقت اور اس کی معنویت کو بہتر طریقے سے سمجھا جاسکے، اور اس کے مطابق عملی قدم اٹھایا جاسکے۔

(۱)

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردُوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹُوٹا ہوا تارا

۱۔ وہ کیا گردوں تھا

گردوں آسمان کو کہتے ہیں۔[۱] پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے گردوں سے مراد قوم لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اے نوجواں! کبھی تو نے اس بات پر بھی غور کیا کہ تو جس قوم کا فرد ہے، وہ کسی زمانہ میں کس قدر عظیم الشان تھی؟"[۲]

علامہ اقبال نے مسلم نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان سے کہا ہے کہ وہ اسلام کے سنہری دور کی عظمت، جلالت اور شان و شوکت کو یاد کریں۔ وہ دور جب مسلمانوں نے علم و حکمت کی بدولت دنیا بھر میں بلند مقام حاصل کیا، اور اس کا اعتراف صرف مسلم نہیں بلکہ غیر مسلم حضرات بھی کرتے ہیں۔ ایک غیر مسلم مؤرخ نے اسی حقیقت کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> The coming of Islam six hundred years after Christ, was the new, powerful impulse. It started as a local event, uncertain in its outcome; but once Muhammad conquered Makkah in 630 AD, it took the southern world by storm. In a hundred years, Islam conquered Alexandria, established a fabulous city of learning in Baghdad and thrust its frontier to the east beyond Isfahan in Persia. By 730 AD the Muslim Empire reached from Spain and Southern France to the borders

---

[۱] ۔ نسیم امروہی، سید قائم رضا، نسیم اللغات اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۷۱۰

[۲] ۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح بانگ درا، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ص ۳۳۸، ۳۴۲

of China and India. An empire of spectacular strength and grace while Europe lapsed into the Dark Age .... Muhammad had been firm that Islam was not to be a religion of miracles, it became in intellectual content a pattern of contemplation and analysis.[1]

"حضرت عیسیٰؑ کے چھ سو برس بعد اسلام کا ظہور ایک نئی توانا تحریک کے طور پر ہوا۔ اس کا آغاز ایک مقامی حیثیت سے ہوا، اور شروع میں نتائج کے اِعتبار سے صورتِ حال غیر یقینی تھی، مگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ۶۳۰ء میں جونہی فاتح بن کر مکہ میں داخل ہوئے تو دنیا کے جنوبی حصہ میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی۔ ایک صدی کے اندر 'اسکندریہ' فتح ہوا، 'بغداد' اِسلامی علم و فضل کا شاندار مرکز بنا اور اسلامی حدوں کی وسعت مشرقی اِیران کے شہر 'اِصفہان' سے آگے نکل گئی۔ ۷۳۰ء تک اِسلامی سلطنت 'اندلس' اور 'جنوبی فرانس' کو سمیٹتی ہوئی 'چین' اور 'ہندوستان' کی سرحدوں تک جا پہنچی۔ طاقت اور وقار کی اس امتیازی شان کے ساتھ جہاں مسلم سلطنت اپنے عروج پر تھی وہاں یورپ اس وقت پستی اور تنزّل کے تاریک دور سے گزر رہا تھا۔... حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اِسلام کو معجزات کے محدود دائرہ میں رکھنے کی بجائے اسے غور و فکر اور تجزیہ کی نمایاں عقلی و فکری چھاپ عطا کی۔"

کئی دیگر مغربی مصنفین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ مغرب کو مسلمانوں کی سائنسی تحقیقات کو پوری طرح سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے میں کئی صدیوں کا وقت لگا۔ مغربی دنیا نے مسلم تہذیب کی سائنسی ترقیات کو ابتدائی طور پر نظر انداز کیا یا ان کی قدر نہیں کی، لیکن جیسے ہی وہ مسلمانوں کی علمی کامیابیوں اور تحقیقات سے آگاہ ہوئے، ان کی اہمیت اور اثرات کو تسلیم کیا۔ مسلمانوں نے اپنے دور میں فلکیات، طب، ریاضی، کیمیاء، اور دیگر سائنسی میدانوں میں جو شاندار ترقی کی، اس کا مغرب نے بعد ازاں بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کئی مغربی دانشوروں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کی سائنسی دریافتوں اور اختراعات نے مغربی عہد کی نشاۃِ ثانیہ اور اس کے بعد کی سائنسی انقلابات میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران مسلمانوں کی تحریروں اور تحقیقوں نے مغربی علم کو نئی جہتیں دیں، اور ان

[1] Bronowski, J., *The Ascent of Man*, pp. 165-166.

سے استفادہ کر کے مغربی دنیا نے اپنی سائنسی ترقیات کی بنیاد رکھی۔ یہ حقیقت مزید اہمیت اختیار کرتی ہے کہ مغرب نے ان سائنسی تحقیقاتی ذخائر کو سمجھنے اور ان سے استفادہ کرنے میں طویل عرصہ لیا، اور اس عمل میں مسلمانوں کی علمی میراث کا کردار انتہائی اہم ثابت ہوا۔ ایک مغربی مورخ لکھتا ہے:

> Its golden age lasted some three centuries, from the ninth to the eleventh century, and it was only toward the end of that period (a little earlier in Spain) that the Latins became aware of the importance of Arabic science. They were fully aware of course of the material power of Islam, though it took two or three centuries of crusades to convince them of their own military inferiority. A nun of Gandersheim (in the duchy of Brunswick), Hrosvitha (X-2) spoke of Cordova the ornament of the world.[1]

''مسلم سائنس کا سنہری زمانہ کم و بیش تین صدیوں، نویں صدی سے گیارہویں صدی تک جاری رہا۔ جب لاطینی عرب سائنس کی اہمیت سے شناسا ہوئے، اس وقت یہ سنہری دور خاتمے کے قریب تھا۔ وہ اسلام کی مادی طاقت سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ اگرچہ انہیں اپنی عسکری کمزوریوں کا ادراک دو تین صدیوں کی صلیبی جنگوں کے بعد ہوا۔ گینڈر شیم کی ایک راہبہ نے قرطبہ کو دنیا کا زیور قرار دیا ہے۔''

ابتدائی مغربی مترجمین اس قابل نہیں تھے کہ وہ مسلمانوں کی علمی تصانیف کو مکمل اور درست طور پر اپنی زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ مسلمانوں کا علمی ورثہ—جس میں فلکیات، طب، کیمیاء، ریاضی اور فلسفہ جیسے پیچیدہ اور دقیق شعبے شامل تھے—مغرب کے لیے ایک نیا اور غیر مانوس جہان تھا، جسے سمجھنا اور اس کا ترجمہ کرنا ابتدائی دور میں ایک بڑا چیلنج ثابت ہوا۔ مغربی مترجمین نہ صرف زبان کے فرق سے دوچار تھے، بلکہ ان کے پاس وہ علمی گہرائی اور وسیع پس منظر بھی نہیں تھا جو مسلمانوں کے علم کو صحیح طور پر سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ، وہ مسلمانوں کی ثقافت، اصطلاحات، اور علمی طریقۂ کار

---

[1] George Sarton, *A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition*, p. 31.

سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔ جارج سارٹن نے اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابتدائی مغربی مترجمین خود اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ مسلمانوں کے علمی ذخیرے کو پوری طرح منتقل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے، کیونکہ وہ اس علم کی پیچیدگیوں اور معنوی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر تھے۔

ان مترجمین کی کوششوں کے باوجود، مسلمانوں کی علمی وراثت کی حقیقت کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں مغرب کو کئی صدیوں کا عرصہ درکار ہوا۔ یہ بات اس بات کا ثبوت ہے کہ مغرب نے مسلمانوں کے علم سے استفادہ کرنے کے لیے نہ صرف ترجمے کے عمل کو بہتر کیا بلکہ اس علم کو اپنے سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کے مطابق سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ اس عمل میں مسلمانوں کی علمی روایات کا مغرب کے سائنسی انقلاب پر بڑا اثر پڑا، اور اس نے مغربی دنیا کو جدید سائنسی اور فلسفیانہ ترقی کی طرف گامزن کیا۔ جارج سارٹن نے لکھا ہے:

> The scientific tradition as it was poured from Arabic vessels into Latin ones was often perverted. The new translators did not have the advantage which the Arabic translators had enjoyed; the latter had been able to see Greek culture in the perspective of a thousand years or more; the Latin translators could not see the Arabic novelties from a sufficient distance, and they could not always choose intelligently between them. As to the Greek classics they came to them with a double prestige, Greek and Arabic. It is as if the Greek treasures, of which Latin scholars were now dimly conscious, were more valuable in their Arabic form; they had certainly become more glamorous. The translation of the Almagest made c. 1175 by Gerard of Cremona (XII-2) from the Arabic, superseded a translation made directly from the Greek in Sicily fifteen years earlier![1]

[1] George Sarton, *A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition*, p. 32.

''جب سائنسی روایت کو عربی کتب سے لاطینی کتب میں منتقل کیا جاتا تھا تو اکثر اسے بگاڑ دیا جاتا تھا۔ کیونکہ نئے مترجمین کو وہ سہولت حاصل نہیں تھی جو عربی مترجمین کو حاصل تھی۔ مؤخر الذکر ایک ہزار سال یا اس سے زیادہ مدت کے تناظر میں یونانی ثقافت کو دیکھنے کے قابل تھے۔ جبکہ لاطینی مترجم اتنے فاصلے سے عربی نزاکتوں اور ندرتوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے، اور وہ کبھی بھی ان میں سے دانشمندانہ انتخاب نہیں کر سکتے تھے۔ یونانی کلاسیکی علوم ان کے پاس دوہرے معیار کے ساتھ آئے یعنی یونانی اور عربی۔ گویا یونانی علمی خزانے، جن کے بارے میں لاطینی علما اب خاموش ہو چکے تھے، اپنی عربی شکل میں زیادہ قابل قدر تھے۔ وہ یقینی طور پر زیادہ پرکشش بن گئے تھے۔ ۱۱۷۵ء میں گیرارڈ نے المجستی کا عربی میں جو ترجمہ کیا وہ پندرہ سال قبل سسلی میں یونانی سے براہ راست کئے گئے ترجمے سے بہتر تھا۔''

علامہ اقبال نے ان اشعار میں نوجوانوں کو اسلام کی وہ عظمت رفتہ یاد دلائی ہے جو ایک وقت میں مسلمانوں کا خاصہ تھی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمان اپنے تاریخ کے سنہری دور کی جلالت، شان و شوکت اور علمی برتری کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کریں۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں علم، فہم، حکمت اور تہذیبی ترقی کے شعبے میں جو بلند مقام حاصل کیا تھا، وہ ایک ایسا ورثہ ہے جس کی بازیابی کے لیے انہیں اپنے عزم، محنت اور فکر کو نئی سمت دینا ہو گی۔

علامہ اقبال کا یہ پیغام محض ماضی کی یاد دلانے تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ نوجوانوں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں سرگرم عمل ہوں اور اسی جذبے کے ساتھ اپنی تہذیب اور دین کی ترقی کے لیے کام کریں جیسے مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں کیا تھا۔ اقبال نوجوانوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اسلام کی اصل روح کو اپناتے ہوئے علم و حکمت کی روشنی سے اپنی تقدیر بدلیں گے اور دنیا میں ایک نئی شان و شوکت قائم کریں گے۔

اس کے علاوہ، اقبال نوجوانوں کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسلام کی عظمت صرف ظاہری طاقت یا حکمرانی میں نہیں تھی بلکہ اس کی اصل طاقت اس کے علمی اور اخلاقی اقدار میں پوشیدہ تھی۔ اس لیے نوجوانوں کو نہ صرف اپنے جسمانی طاقت و اختیار پر زور دینا چاہیے بلکہ

انہیں اپنی فکری، ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو بھی مضبوط کرنا ہو گا تاکہ وہ ایک مرتبہ پھر اسلامی تہذیب کے عظیم ورثے کو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

(۲)

کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

۲۔ تاج سر دارا

تاج سرِ دارا سے مراد وہ عجمی طاقتیں ہیں جن کا اسلام کے ابتدائی دور میں دنیا پر غلبہ تھا لیکن مسلمانوں نے اپنے ایمان، کردار اور علم کی طاقت سے ان طاقتوں کو شکست فاش دی اور دنیا کو اسلام کے پیغام سے روشناس کروایا۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں "دارا"[1] اور "تاج سر دارا"[2] دونوں اصطلاحات استعمال کی ہیں۔

---

[1] ۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں کئی مقامات پر "دارا" کی تلمیح استعمال کی ہے، مثلاً درج ذیل اشعار:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

(علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۷۳)

عاشق عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسند دارا و اسکندر پہ میں

(کلیات اقبال اردو، ص ۹۶)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

(کلیات اقبال اردو، ص ۳۹۰)

تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا

(کلیات اقبال اردو، ص ۲۷۱)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں دارا کے ذیل میں لکھا ہے:

"دارا: (= داراب)، یہ اس ہخامنشی بادشاہ کے نام کی ایرانی صورتیں ہیں (عرب مصنفین نے بھی انہیں کو اختیار کیا ہے)، جو (یورپ میں) عام طور پر اپنی یونانی شکل داریوش (Darius) Dareios ہی میں لکھا جاتا ہے۔ داراب اور اس کا مخفف دارا براہ راست قدیم فارسی کے داریوہش سے لیے گئے ہیں۔"[1]

دائرہ معارف میں مزید لکھا ہے:

المسعودی کا بیان بھی مختصر ہے۔ اس نے داریوش دوم اور داریوش سوم دونوں کو ایک ہی نام (دارا) سے یاد کیا ہے۔ الثعالبی: History of the Kings of the Persians (طبع و ترجمہ از Zotenberg، ص ۳۹۳ ببعد) میں بھی اس داراب کے اشتقاق کی ایسی ہی خیالی وجوہ درج ہیں۔ اس کا بیان الطبری کے بیان سے مماثل ہے اور اس میں بھی دارا کے کردار اور اسکندر کی منافقت کو وثوق سے بیان کیا گیا ہے۔[2]

پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

دارا قدیم ایران کا مشہور بادشاہ جسے سکندر نے ۳۲۸ق م میں شکست دی تھی۔ تاج سر دارا سے مملکت ایران مراد ہے جسے مسلمانوں نے فاروق اعظم کے عہد خلافت میں فتح کیا تھا۔[3]

حضرت نسیم امروہی فرہنگ اقبال میں لکھتے ہیں:

دارا: قدیم فارس (ایران) کے ایک مشہور بادشاہ کا نام جسے سکندر رومی نے شکست دی تھی۔[1]

۲۔ علامہ اقبال نے درج ذیل شعر میں "تاج سر دارا" کی اصطلاح استعمال کی ہے:

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

(کلیات اقبال اردو، ص ۷۱۳)

۱ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۲ء، ج ۹، ص ۱۴۹۔

۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۲ء، ج ۹، ص ۱۵۰۔

۳۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح بانگ درا، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ص ۳۳۸ - ۳۳۹

مسلمانوں کی افواج اور قدیم فارس کی عسکری اور تہذیبی پس منظر رکھنے والی ایرانی فوجوں کے درمیان ہونے والے معرکوں کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے موجود ہے۔ یہ معرکے نہ صرف فوجی سطح پر بلکہ تہذیبی اور عقیدتی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ ان جنگوں میں مسلمانوں نے ایک طاقتور اور قدیم عالمی طاقت کو شکست دی، جو اپنے عہد کی سب سے بڑی عسکری قوتوں میں سے تھی۔ اس سلسلے میں، شبلی نعمانی کی کتاب "الفاروق " میں اس جنگ کی تفصیلات موجود ہیں جو اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ مسلمانوں نے کس طرح ایمان اور عزم کے ساتھ ایرانی افواج کا مقابلہ کیا اور ان کی طاقت کو شکست فاش دی۔

جب مسلمانوں کا ایرانی افواج سے سامنا ہوا، تو ایرانی سلطنت اس وقت اپنی پوری طاقت میں تھی اور ایک عالمی سپر پاور کے طور پر جانی جاتی تھی۔ تاہم، مسلمانوں نے اپنے مضبوط ایمان، جذبۂ جہاد، اور اللہ کی مدد پر یقین رکھتے ہوئے ایرانی فوج کو نہ صرف مقابلے میں شکست دی، بلکہ ان کی عظمت و طاقت کے غرور کو بھی پاش پاش کر دیا۔ شبلی نعمانی اپنی کتاب "الفاروق" میں اس جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کس طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمانوں نے ایرانی فوج کو حیرت انگیز طور پر شکست دی۔ ان کے مطابق، جنگ کے دوران مسلمانوں کی قوت ایمانی اور حکمت عملی نے ایرانی فوج کو اس قدر دُھچکا پہنچایا کہ وہ اس شکست کے بعد اپنے ماضی کے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

شبلی نعمانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ایرانی افواج کی شکست اس بات کا غماز تھی کہ صرف مادی طاقت یا عسکری مہارت ہی کسی قوم کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتی، بلکہ ایمان، عزم، اور اللہ کی رضا کے لیے کی جانے والی کوششیں کہیں زیادہ اہم ہیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح ایک روشن مثال ہے کہ کس طرح ایمانی قوت اور اتحاد نے دنیا کی سب سے طاقتور فوجوں کو پچھاڑ دیا اور ایک نئی تاریخ رقم کی۔ شبلی نعمانی اپنی کتاب "الفاروق" میں ایران کے ساتھ ہونے والی جنگ کے احوال ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

---

[1] حضرت نسیم امروہی، فرہنگ اقبال، اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۳۸۔

رستم نے پہلی تدبیر یہ کی کہ اضلاع عراق میں ہر طرف ہرکارے اور نقیب دوڑا دیئے جنہوں نے مذہبی حمیت کا جوش دلا کر تمام ملک میں مسلمانوں کے برخلاف بغاوف پھیلا دی، ..... ادھر ابو عبیدہ اور مثنیٰ حیرہ تک پہنچ چکے تھے کہ دشمن کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا، مصلحت دیکھ کر خفان کو ہٹ آئے، جابان نمارق پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ ..... نمازق پر دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ جابان کے میمنہ و میسرہ پر جوشن شاہ اور مردان شاہ دو مشہور افسر تھے، جو بڑی ثابت قدمی سے لڑے لیکن بالآخر شکست کھائی عین معرکہ میں گرفتار ہوئے۔ مردان شاہ بدقسمتی سے اسی وقت قتل کر دیا گیا۔ لیکن جابان اس حیلے سے بچ گیا کہ جس شخص نے اس کو گرفتار کیا تھا وہ اس کو پہچانتا نہ تھا۔ جابان نے اس سے کہا کہ میں اس بڑھاپے میں تمہارے کس کام کا ہوں، مجھ کو چھوڑ دو اور معاوضے میں مجھ سے دو جوان غلام لے لو۔ اس نے منظور کر لیا۔ بعد میں لوگوں نے جابان کو پہچانا تو غل مچایا کہ ہم ایسے دشمن کو چھوڑنا نہیں چاہتے لیکن ابو عبیدہ نے کہا کہ اسلام میں بدعہدی جائز نہیں۔[1]

ابو عبیدہ نے اس معرکہ کے بعد کسکر کا رخ کیا اور نرسی فوج کو شکست دی۔ اس شکست کی خبر سن کر رستم نے مروان شاہ کو چار ہزار فوج کے ساتھ بھیجا۔ ایرانی فوج کا نظارہ نہایت مہیب تھا، بہت سے کوہ پیکر ہاتھی تھے جن پر گھنٹے لٹکتے تھے اور بڑے زور سے بجتے جاتے تھے۔ گھوڑوں پر آہنی پاکھریں تھیں، سوار سمور کی لمبی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے صحرائی جانور معلوم ہوتے تھے۔ عرب کے گھوڑوں نے یہ مہیب نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا، بدک کر پیچھے ہٹے، ابو عبیدہ نے دیکھا کہ ہاتھیوں کے سامنے کچھ زور نہیں چلتا، گھوڑے سے کود پڑے۔ ہاتھیوں پر حملہ کرتے ہوئے ایک ہاتھی کا ان پر پاؤں آ گیا اور وہ شہید ہو گئے۔ ابو عبیدہ اور ان کے بھائی حکم سمیت خاندان ثقیف کے سات آدمیوں نے باری باری علم ہاتھ میں لیا اور شہید ہوئے۔ آخر میں مثنیٰ نے علَم لیا۔ بچی کچھی فوج کے ساتھ ایرانیوں کا مقابلہ کیا اور ان کی پیش قدمی روک دی۔ تاہم نو ہزار فوج میں سے صرف تین ہزار رہ گئی۔[2]

اس شکست نے حضرت عمرؓ کو سخت برہم کیا اور نہایت زور و شور سے حملہ کی تیاریاں کیں۔ تمام عرب میں خطبا اور نقیب بھیج دیئے جنہوں نے پر جوش تقریروں سے تمام عرب میں

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، س ن، الفاروق، ص ۱۳۸

[2] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۱۳۷ - ۱۴۲

ایک آگ لگادی اور ہر طرف سے عرب کے قبائل اُمنڈ آئے۔ قبیلہ ازد کا سردار مخنف بن سلیم سات سو سواروں کو ساتھ لے کر آیا۔ بنو تمیم کے ہزار آدمی حصین بن معبد کے ساتھ آئے۔ حاتم طائی کے بیٹے عدی ایک جمعیت کثیر لے کر پہنچے۔ اسی طرح قبیلہ رباب، بنو کنانہ، قشعم، بنو حنظلہ، بنو ضبہ کے بڑے بڑے جتھے اپنے اپنے سرداروں کے ساتھ آئے۔ یہ جوش یہاں تک پھیلا کہ نمر د تغلب کے سرداروں نے جو مذہباً عیسائی تھے، حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ آج عرب و عجم کا مقابلہ ہے۔ اس قومی معرکہ میں ہم بھی قوم کے ساتھ ہیں۔ ان دونوں سرداروں کے ساتھ ان کے قبیلے کے ہزاروں آدمی تھے اور عجم کے مقابلہ کے جوش میں لبریز تھے۔

اتفاق سے انہی دنوں جریر بجلیؓ دربار خلافت میں حاضر ہوا۔ یہ ایک مشہور سردار تھا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی تھی کہ اپنے قبیلے کا سردار مقرر کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ درخواست منظور کر لی تھی لیکن تعمیل کی نوبت نہیں آئی تھی۔ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا تو انہوں نے عرب کے تمام عمّال کے نام احکام بھیج دیئے کہ جہاں جہاں اس کے قبیلے کے آدمی ہوں تاریخ معین پر اس کے پاس پہنچ جائیں، جریرؓ یہ جمعیت اعظم لے کر دوبارہ مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے۔

ادھر مثنیٰؓ نے عراق کے تمام سرحدی مقامات میں نقبا بھیج کر ایک بڑی فوج جمع کر لی تھی۔ ایرانی جاسوسوں نے یہ خبریں شاہی دربار میں پہنچائیں۔ پوران دخت نے حکم دیا کہ فوج خاصہ سے بارہ ہزار سوار انتخاب کیے جائیں اور مہران بن مہرویہ ہمدانی افسر مقرر کیا جائے۔ مہران کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ اس نے خود عرب میں تربیت پائی تھی اور اس وجہ سے وہ عرب کے زور و قوت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ کوفہ کے قریب بویب نام ایک مقام تھا، اسلامی فوجوں نے یہاں پہنچ کر ڈیرے ڈالے۔ مہران پایہ تخت سے روانہ ہو کر سیدھا بویب پہنچا اور دریائے فرات کو بیچ میں ڈال کر خیمہ زن ہوا، صبح ہوئے فرات سے اتر کر بڑے سروسامان سے لشکر آرائی شروع کی۔ مثنیٰؓ نے بھی نہایت ترتیب سے صف درست کی۔ فوج کے مختلف حصے کر کے بڑے بڑے ناموروں کی ماتحتی میں دیئے۔ چنانچہ میمنہ پر مذعور، میسرہ پر نسیر، پیدل پر مسعود، والنظیر پر عاصم، گشت کی فوج پر عصمہ کو مقرر کیا۔ لشکر آراستہ ہو چکا تو مثنیٰؓ

نے اس سرے سے اس سرے تک ایک بار چکر لگایا اور ایک ایک علَم کے پاس کھڑے ہو کر کہا: ''بہادرو! دیکھنا تمہاری وجہ سے تمام عرب پر بدنامی کا داغ نہ آجائے''۔

اسلامی فوج کی لڑائی کا یہ قاعدہ تھا کہ سردار تین مرتبہ اللہ اکبر کہتا تھا۔ پہلی تکبیر پر فوج حربہ ہتھیار سے آراستہ ہو جاتی تھی۔ دوسری تکبیر پر لوگ ہتھیار تول لیتے تھے اور تیسرے نعرہ پر حملہ کر دیا جاتا تھا۔ مثنیؓ نے دوسری تکبیر ابھی نہیں کہی تھی کہ ایرانیوں نے حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر مسلمان ضبط نہ کر سکے اور کچھ لوگ جوش میں آکر صف سے نکل گئے۔ مثنیؓ نے غصے میں آکر داڑھی دانتوں میں دبالی اور پکارے کہ اللہ کے لیے اسلام کو رسوا نہ کرو۔ اس آواز کے ساتھ فوراً لوگ پیچھے ہٹے اور جس شخص کی جہاں جگہ تھی وہیں آکر جم گیا۔ چوتھی تکبیر کہہ کر مثنیؓ نے حملہ کیا۔

عجمی اس طرح گرجتے ہوئے بڑھے کہ میدان جنگ گونج اٹھا۔ مثنیؓ نے فوج کو للکارا کہ گھبرانا نہیں یہ نامردانہ غل ہے۔ عیسائی سرداروں کو جو ساتھ تھے، بلا کر کہا کہ تم اگرچہ عیسائی ہو لیکن ہم قوم ہو اور آج قوم کا معاملہ ہے، میں مہران پر حملہ کرتا ہوں تم ساتھ رہنا۔ انہوں نے لبیک کہا۔ مثنیؓ نے ان سرداروں کو دونوں بازوؤں پر لے کر دھاوا بول دیا۔ پہلے ہی حملہ میں مہران کا میمنہ توڑ کر قلب میں گھس گئے۔ عجمی دوبارہ سنبھلے اور اس طرح ٹوٹ کر گرے کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ مثنیؓ نے للکارا کہ مسلمانو! کہاں جاتے ہو؟ میں یہ کھڑا ہوں۔ اس آواز کے ساتھ سب پلٹ آئے۔ مثنیؓ نے ان کو سمیٹ کر پھر حملہ کیا۔ عین اس حالت میں مسعود جو مثنیؓ کے بھائی تھے اور مشہور بہادر تھے، زخم کھا کر گرے۔ ان کی رکاب کی فوج بے دل ہوا چاہتی تھی۔ مثنیؓ نے للکارا کہ مسلمانو! میرا بھائی مارا گیا تو کچھ پرواہ نہیں شرفا یوں ہی جان دیا کرتے ہیں۔ دیکھو تمہارے علم جھکنے نہ پائیں۔ خود مسعود نے گرتے گرتے کہا کہ میرے مرنے سے بے دل نہ ہونا۔

دیر تک بڑی گھمسان کی لڑائی رہی۔ انس بن ہلال جو عیسائی سردار تھا اور بڑی جانبازی سے لڑ رہا تھا، زخم کھا کر گرا۔ مثنیؓ نے خود گھوڑے سے اتر کر اس کو گود میں لیا اور اپنے بھائی مسعود کے ساتھ لٹا دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے بڑے بڑے افسر مارے گئے۔ لیکن مثنیؓ کی ثابت قدمی کی وجہ سے لڑائی کا پلہ اسی طرف بھاری رہا۔ عجم کا قلب خوب جم کر لڑا مگر کل کا کل برباد ہو گیا۔ شہر براز جو ایک مشہور افسر تھا قرط کے ہاتھ سے مارا گیا۔ تاہم سپہ سالار مہران

ثابت قدم تھا اور بڑی بہادری سے تیغ بکف لڑ رہا تھا کہ قبیلہ تغلب کے ایک نوجوان نے تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ مہران گھوڑے سے گرا تو نوجوان اچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھا اور فخر کے لہجہ میں پکارا۔ میں ہوں تغلب کا نوجوان اور رئیس عجم کا قاتل۔

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی جرات اور ایمانی قوت سے عظیم فتوحات حاصل کیں۔ مثلا قبیلہ تغلب کے صرف ایک نوجوان نے ایرانی سپہ سالار مہران کو قتل کر کے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا، جس کے بعد ایرانی فوج کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ مسلمانوں نے قادسیہ میں بھی ایرانی فوج کا مقابلہ کیا، اور سفیروں کی جرات مندانہ کارروائی سے ایرانی بادشاہ یزدگرد کے غرور کو توڑتے ہوئے مسلمانوں نے اپنی فتح کا راستہ ہموار کیا۔ ابن جریر طبری نے لکھا:

وقتل غلام من التغلبيين نصراني مهران واستوى على فرسه[1]

قبیلہ تغلب کے ایک نوجوان نے مہران کو قتل کر کے اس پر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

مہران کے قتل پر لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ عجم نہایت ابتری سے بھاگے۔ مثنیٰؓ نے فوراً پل کے پاس پہنچ کر رستہ روک لیا اور عجم بھاگ کر نہ جانے پائیں مورخین کا بیان ہے کہ کسی لڑائی میں اس قدر بے شمار لاشیں اپنی یادگار میں نہیں چھوڑیں۔ چنانچہ مدتوں کے بعد جب مسافروں کا ادھر سے گزر ہوا تو انہوں نے جابجا ہڈیوں کے انبار پائے۔ اس فتح کا ایک خاص اثر یہ ہوا کہ عربوں پر عجم کا جو رعب چھایا ہوا تھا جاتا رہا۔ ان کو یقین ہو گیا کہ اب سلطنت کسریٰ کے اخیر دن آ گئے۔ خود مثنیٰؓ کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے میں بارہا عجم سے لڑ چکا ہوں اس وقت سو عجمی ہزار عرب پر بھاری تھے۔ لیکن آج ایک عرب دس عجمی پر بھاری ہے۔[2]

قادسیہ (یہ کوفہ سے ۳۵ میل پر ایک چھوٹا سا شہر تھا) نہایت شاداب اور نہروں اور پلوں کی وجہ سے محفوظ مقام تھا۔ حضرت عمرؓ جاہلیت میں ان مقامات میں سے اکثر گزرتے تھے۔ اور اس موقع کی ہئیت اور کیفیت سے واقف تھے۔۔ چنانچہ سعدؓ کو جو فرمان بھیجا اس میں قادسیہ کا موقع اور محل بھی مذکور تھا۔ تاہم چونکہ پرانا تجربہ تھا سعدؓ کو لکھا کہ قادسیہ پہنچ کر سرزمین کا پورا نقشہ لکھ کر بھیجو کیونکہ میں نے بعض ضروری باتیں اسی وجہ سے نہیں لکھیں کہ موقع اور

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک، ۳: ۴۶۶

[2] ۔ شبلی نعمانی، الفاروق، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، س ن، ص ۱۴۳ تا ۱۷۴

مقام کے پورے حالات مجھ کو معلوم نہ تھے۔ سعدؓ نے نہایت تفصیل سے موقع جنگ کی حدود اور حالات لکھ کر بھیجے۔ دربار خلافت سے روانگی کی اجازت آئی۔

چنانچہ سعدؓ شراف سے چل کر عذیب پہنچے۔ یہاں عجمیوں کا میگزین رہا کرتا تھا اور وہ مفت ہاتھ آیا۔ قادسیہ پہنچ کر سعدؓ نے ہر طرف ہرکارے دوڑائے کہ غنیم کی خبر لائیں۔ انہوں نے آکر بیان کیا کہ رستم (پسر فرخ زاد) جو آرمینیہ کا رئیس ہے، سپہ سالار مقرر ہوا ہے اور مدائن سے چل کر ساباط میں ٹھہرا ہے۔ سعدؓ نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ وہاں سے جواب آیا کہ لڑائی سے پہلے کچھ لوگ سفیر بن کر جائیں اور ان کو اسلام کی رغبت دلائیں۔ سعدؓ نے سردارانِ قبائل میں سے چودہ نامور اشخاص انتخاب کیے جو مختلف صفتوں کے لحاظ سے تمام عرب میں منتخب تھے۔ عطارد بن حاجب، اشعث بن قیس، حارث بن حسان، عاصم بن عمر، عمرو بن معدی کرب، مغیرہ بن شعبہ اور معنی بن حارثہؓ قد و قامت اور ظاہری رعب و داب کے لحاظ سے تمام عرب میں مشہور تھے۔ نعمان بن مقرن، بسر بن ابی رہم، حملہ بن جوتیہ، حنظلہ بن الربیع التمیمی، فرات بن حیان العجلی، عدی بن سہیل، مغیرہ بن زرارہؓ عقل و تدبیر اور حزم و سیاست میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

ساسانیوں کا پائے تخت قدیم زمانے میں اصطخر تھا لیکن نوشیروان نے مدائن کو دارالسلطنت قرار دیا تھا اور اس وقت سے وہی پائے تخت چلا آرہا تھا۔ یہ مقام سعدؓ کی فرود گاہ یعنی قادسیہ سے ۳۰ - ۴۰ میل کے فاصلے پر تھا۔ سفراء گھوڑے اڑاتے ہوئے سیدھے مدائن پہنچے۔ راہ میں جدھر سے گزر ہوتا تھا تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آستانہ سلطنت کے قریب پہنچ کر ٹھہرے۔ اگرچہ ان کی ظاہری صورت یہ تھی کہ گھوڑوں پر زین اور ہاتھوں میں ہتھیار تک نہ تھا۔ تاہم بے باکی اور دلیری ان کے چہروں سے ٹپکتی تھی۔ اور تماشائیوں پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ گھوڑے جو سواری میں تھے، رانوں سے نکلے جاتے تھے اور بار بار زمین پر ٹاپ مارتے تھے، چنانچہ ٹاپوں کی آواز یزدگرد کے کان تک پہنچی اور اس نے دریافت کیا کہ یہ آواز کیسی ہے؟ معلوم ہوا کہ اسلام کے سفراء آئے ہیں۔ یہ سن کر بڑے سروسامان سے دربار سجایا اور سفراء کو طلب کیا۔ یہ لوگ عربی جبے پہنے کاندھوں پر یمنی چادریں ڈالے ہاتھوں میں کوڑے لیے موزے چڑھائے ہوئے دربار میں داخل ہوئے۔ پچھلے معرکوں نے

تمام ایران میں عرب کی دھاک بٹھا دی تھی۔ یزدگرد نے سفیروں کو اس شان سے دیکھا تو اس پر ایک ہیبت طاری ہوئی۔[1]

ایرانی عموماً ہر چیز سے فال لینے کے عادی تھے۔ یزدگرد نے پوچھا کہ عربی میں چادر کو کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: بُرد۔ اس نے (فارسی معنی کے لحاظ سے) کہا کہ جہاں برد۔ پھر کوڑے کی عربی پوچھی۔ ان لوگوں نے کہا کہ سوط۔ وہ سوخت سمجھا اور بولا کہ پارس را سوختند۔ ان بدفالیوں پر سارا دربار برہم ہوا جاتا تھا لیکن شاہی آداب کے لحاظ سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر سوال کیا کہ تم اس ملک میں کیوں آئے ہو؟ نعمان بن مقرن جو سرگروہ تھے، جواب دینے کے لیے آگے بڑھے۔ پہلے مختصر طور پر اسلام کے حالات بیان کیے پھر کہا کہ ہم تمام دنیا کے سامنے دو چیزیں پیش کرتے ہیں جزیہ یا تلوار۔ یزدگرد نے کہا: تم کو یاد نہیں کہ دنیا میں تم سے زیادہ ذلیل اور بدبخت کوئی قوم نہ تھی۔ تم جب کبھی ہم سے سرکشی کرتے تھے تو سرحد کے زمینداروں کو حکم بھیج دیا جاتا تھا اور وہ تمہارا بل نکال دیتے تھے۔

اس پر سب نے سکوت کیا لیکن مغیرہ بن زرارہ ضبط نہ کر سکے اور اٹھ کر کہا کہ یہ لوگ (اپنے رفیقوں کی طرف اشارہ کر کے) رؤسائے عرب ہیں اور حلم و وقار کی وجہ سے زیادہ گوئی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے جو کچھ کہا یہی زیبا تھا لیکن کہنے کے قابل باتیں رہ گئیں۔ ان کو میں بیان کرتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ ہم بدبخت اور گمراہ تھے۔ آپس میں کٹتے مرتے تھے۔ اپنی لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر ایک پیغمبر بھیجا جو حسب و نسب میں ہم سے ممتاز تھا۔ اول اول ہم سب نے اس کی مخالفت کی۔ وہ سچ کہتا تھا تو ہم جھٹلاتے تھے، وہ آگے بڑھتا تھا تو ہم پیچھے ہٹتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس کی بات نے دلوں پر اثر کیا۔ وہ جو کچھ کہتا تھا اللہ کے حکم سے کہتا تھا اور جو کچھ کرتا تھا اللہ کے حکم سے کرتا تھا۔ اس نے ہم کو حکم دیا کہ اس مذہب کو تمام دنیا کے سامنے پیش کرو جو لوگ اسلام لائیں وہ تمام حقوق میں تمہارے برابر ہیں۔ جن کو اسلام سے انکار ہو اور جزیہ پر راضی ہوں وہ اسلام کی حمایت میں ہیں۔ جس کو دونوں باتوں سے انکار ہو اس کے لیے تلوار ہے۔ یزدگرد غصے سے بے تاب ہو گیا اور کہا کہ اگر قاصدوں کا قتل کرنا جائز ہوتا تو تم میں سے کوئی زندہ بچ کر نہ جاتا۔ یہ کہہ کر مٹی کا ٹوکرا منگوایا اور کہا

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، س ن، ص ۱۵۴ تا ۱۵۵

کہ تم میں سے سب سے معزز کون ہے؟ عاصم بن عمر نے بڑھ کر کہا: میں۔ ملازموں نے ٹوکرا ان کے سر پر رکھ دیا۔ وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے سعدؓ کے پاس پہنچے کہ فتح مبارک! دشمن نے اپنی زمین خود ہم کو دے دی۔

اس واقعہ کے بعد کئی مہینے تک دونوں طرف سکوت رہا۔ رستم جو سلطنت فارس کی طرف سے اس مہم پر مامور تھا۔ ساباط میں لشکر لیے پڑا تھا اور یزدگرد کی تاکید پر بھی لڑائی کو ٹالتا جاتا تھا۔ ادھر مسلمانوں کا یہ معمول تھا کہ آس پاس کے دیہات پر چڑھ جاتے تھے اور رسد کے لیے مویشی وغیرہ لوٹ لاتے تھے۔ اس عرصے میں بعض بعض رئیس ادھر سے ادھر آ گئے۔ ان میں جوشن شاہ بھی تھا جو سرحد کی اخبار نویسی پر مامور تھا۔ اس حالت نے طول کھینچا تو رعایا جوق در جوق یزدگرد کے پاس پہنچ کر فریادی ہوئی کہ اب ہماری حفاظت کی جائے ورنہ ہم اہل عرب کے مطیع ہوئے جاتے ہیں۔ چار ناچار رستم کو مقابلے کے لیے بڑھنا پڑا۔ ساٹھ ہزار کی جمعیت کے ساتھ ساباط سے نکلا اور قادسیہ پہنچ کر ڈیرے ڈالے لیکن فوج جن جن مقامات سے گزری ہر جگہ نہایت بے اعتدالیاں کیں۔ تمام افسر شراب پی کر بدمستیاں کرتے تھے اور لوگوں کے ناموس تک کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ان باتوں نے عام ملک میں یہ خیال پھیلا دیا کہ سلطنت عجم اب فنا ہوتی نظر آتی ہے۔

رستم کی فوجیں جس دن ساباط سے بڑھیں سعدؓ نے ہر طرف جاسوس پھیلا دیے کہ دم دم کی خبریں پہنچتی رہیں۔ فوج کا رنگ ڈھنگ لشکر کی ترتیب اتارے کا رخ ان باتوں کے دریافت کے لیے فوجی افسر متعین کیے۔ اس میں کبھی کبھی دشمن کا سامنا بھی ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ طلحہ رات کے وقت رستم کے لشکر میں لباس بدل کر گئے۔ ایک جگہ ایک بیش بہا گھوڑا تھان پر بندھا دیکھا۔ تلوار سے باگ ڈور کاٹ کر اپنے گھوڑے کی ڈور سے اٹکالی۔ اس عرصے میں لوگ جاگ اٹھے اور ان کا تعاقب کیا۔ گھوڑے کا ایک سوار مشہور افسر تھا اور ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ اس نے قریب پہنچ کر برچھی کا وار کیا۔ انہوں نے خالی کر دیا۔ وہ زمین پر گرا انہوں نے جھک کر برچھی ماری کہ سینے کے پار ہو گئی۔ اس کے ساتھ دو اور سوار تھے، ان میں سے ایک ان کے ہاتھ سے مارا گیا اور دوسرے نے اس شرط پر امان طلب کی کہ میں قیدی بن کر ساتھ چلتا ہوں۔ اتنے عرصے میں تمام فوج میں ہل چل پڑ گئی اور لوگ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے لیکن طلحہ لڑتے بھڑتے صاف نکل آئے اور ساٹھ ہزار فوج دیکھتی کی دیکھتی

رہ گئی۔ قیدی نے سعدؓ کے سامنے آکر اسلام قبول کیا اور کہا کہ دونوں سوار جو طلحہ کے ہاتھ سے مارے گئے، میرے ابن عم تھے اور ہزار ہزار سوار کے برابر مانے جاتے تھے۔ اسلام کے بعد قیدی کا نام مسلم رکھا گیا اور اس کی وجہ سے دشمن کی فوج کے بہت سے ایسے حالات معلوم ہوئے جو اور کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ بعد کے تمام معرکوں میں شریک رہا اور ہر موقع پر ثابت قدمی اور جانبازی کے جوہر دکھائے۔

رستم چونکہ لڑنے سے جی چراتا تھا۔ ایک دفعہ اور صلح کی کوشش کی۔ سعدؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ تمہارا کوئی معتمد آدمی آئے تو صلح کے متعلق گفتگو کی جائے۔ سعدؓ نے ربعی بن عامر کو اس خدمت پر مامور کیا۔ وہ عجیب و غریب ہیئت سے چلے، عرق گیر کی زرہ بنائی اور اسی کا ایک ٹکڑا سر سے لپیٹ لیا۔ کمر میں رسی کا پٹکا باندھا اور تلوار کے میان پر چیتھڑے لپیٹ لیے۔ اس ہیئت کذائی سے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے۔ ادھر ایرانیوں نے بڑے سر و سامان سے دربار سجایا۔ دیبا کا فرش زرین گاؤ تکیے، حریر کے پردے، صدر میں مرصع تخت، ربعی فرش کے قریب آکر گھوڑے سے اترے اور باگ ڈور کو گاؤ تکیے سے اٹکا دیا۔

درباری بے پروائی کی ادا سے اگرچہ کچھ نہ بولے تاہم دستور کے موافق ہتھیار رکھوالینا چاہا انہوں نے کہا میں بلایا ہوا آیا ہوں تم کو اس طرح میرا آنا منظور نہیں تو میں الٹا پھر جاتا ہوں۔ درباریوں نے رستم سے عرض کی اس نے اجازت دے دی۔ یہ نہایت بے پروائی کی ادا سے آہستہ آہستہ تخت کی طرف بڑھے لیکن برچھی جس سے عصا کا کام لیا تھا اس کی انی کو اس طرح فرش پر چبھوتے جاتے کہ پر تکلف فرش اور قالین جو بچھے ہوئے تھے جا بجا سے کٹ پھٹ کر بیکار ہو گئے۔ تخت کے قریب پہنچ کر زمین پر نیزہ مارا جو فرش کو آر پار کر کے زمین میں گڑ گیا۔ رستم نے پوچھا کہ اس ملک میں کیوں آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اس لیے کہ مخلوق کی بجائے خالق کی عبادت کی جائے۔ رستم نے کہا: میں ارکان سلطنت سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔ درباری بار بار ربعی کے پاس آکر ہتھیار دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اسی سامان پر ایران کی فتح کا ارادہ ہے؟ لیکن جب ربعی نے تلوار میان سے نکالی تو آنکھوں سے بجلی سی کوند گئی اور جب اس کے کاٹ کی آزمائش کے لیے ڈھالیں پیش کی گئیں تو ربعی نے ان کے ٹکڑے اڑا دیے۔ ربعی اس وقت چلے آئے لیکن نامہ و پیام کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اخیر سفارت میں مغیرہؓ گئے۔ اس دن ایرانیوں نے بڑے ٹھاٹھ سے دربار جمایا۔ جس قدر ندیم اور افسر تھے تاج زر پہن کر کرسیوں پر بیٹھے۔ خیمے میں دیبا و سنجاب کا فرش بچھایا گیا اور اللہم اور منصب دار قرینے سے دو رویہ پرے سے جما کر کھڑے ہوئے۔ مغیرہؓ گھوڑے سے اتر کر سیدھے صدر نشیں کی طرف بڑھے اور رستم کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ اس گستاخی پر تمام دربار برہم ہو گیا۔ یہاں تک کہ چوبداروں نے بازو پکڑ کر ان کو تخت سے اتار دیا۔ مغیرہ نے افسران دربار کی طرف خطاب کر کے کہا کہ میں خود نہیں آیا بلکہ تم نے بلایا تھا۔ اس لیے مہمان کے ساتھ یہ سلوک زیبا نہ تھا۔ تمہاری طرح ہم لوگوں میں یہ دستور نہیں کہ ایک شخص اللہ بن کر بیٹھے اور تمام لوگ اس کے آگے بندہ ہو کر گردن جھکائیں۔ مترجم نے جس کا نام عبود تھا اور حیرہ کا باشندہ تھا، اس تقریر کا ترجمہ کیا تو سارا دربار متاثر ہوا اور بعض بعض بول اٹھے کہ ہماری غلطی تھی جو ایسی قوم کو ذلیل سمجھتے تھے۔ رستم بھی شرمندہ ہوا اور ندامت مٹانے کو کہا کہ یہ نوکروں کی غلطی تھی۔ میرا ایما یا حکم نہ تھا پھر بے تکلفی کے طور پر مغیرہ کے ترکش سے تیر نکالے اور ہاتھ میں لے کر کہا کہ ان تکلوں سے کیا ہو گا؟ مغیرہ نے کہا کہ آگ کی لو گو چھوٹی ہو پھر بھی آگ ہے۔ رستم نے ان کی تلوار کا نیام دیکھ کر کہا کہ کس قدر بوسیدہ ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں لیکن تلوار پر باڑھ ابھی رکھی گئی ہے۔ اس نوک جھوک کے بعد معاملے کی بات شروع ہوئی۔ رستم نے سلطنت کی شان و شوکت کا ذکر کر کے اظہار احسان کے طور پر کہا کہ اب بھی واپس چلے جاؤ تو ہم کو کچھ ملال نہیں، بلکہ کچھ انعام دلایا جائے گا۔ مغیرہ نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اگر اسلام و جزیہ منظور نہیں تو اس سے فیصلہ ہو گا۔ رستم غصہ سے بھڑک اٹھا اور کہا کہ آفتاب کی قسم! کل تمام عرب کو برباد کر دوں گا۔ مغیرہ اٹھ کر چلے آئے اور صلح و آشتی کی تمام امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

قادسیہ[2] کی جنگ اور فتح (محرم ۱۴ ہجری ۶۳۵ء) :

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۱۵۳ تا ۱۶۱

[2] قادسیہ عراق کا ایک تاریخی شہر تھا جو ساسانی سلطنت اور خلافت راشدہ کے دور میں اہمیت رکھتا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں مسلمانوں اور ساسانیوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ قادسیہ لڑی گئی، جس نے اسلامی فتوحات کی راہ ہموار کی۔ قدیم ریکارڈز کے مطابق قادسیہ، جنوبی میسوپوٹیمیا میں موجودہ الحلہ کے جنوب مغرب میں اور کوفہ کے قریب واقع تھا۔ تاہم، اُس دور کے اصل مقام کی درست

رستم اب تک لڑائی کو برابر ٹالتا جاتا تھا لیکن مغیرہ کی گفتگو نے اس کو اس قدر غیرت دلائی کہ اسی وقت کمر بندی کا حکم دیا۔ نہر جو بیچ میں حائل تھی حکم دیا کہ صبح ہوتے ہوئے پاٹ کر سڑک بنادی جائے۔ صبح تک یہ کام انجام کو پہنچا اور دوپہر سے پہلے پہلے فوج نہر کے اس پار آ گئی خود سامان جنگ سے آراستہ ہوا دہری زرہیں پہنیں، سر پر خود رکھا، ہتھیار لگائے پھر اسپ خاصہ طلب کیا اور سوار ہو کر جوش میں کہا کہ کل عرب کو چکنا چور کر دوں گا۔ کسی سپاہی نے کہا کہ ہاں اگر اللہ نے چاہا۔ بولا کہ اللہ نے نہ چاہا تب بھی۔

فوج نہایت ترتیب سے آراستہ کی۔ آگے پیچھے تیرہ صفیں قائم کیں۔ قلب کے پیچھے ہاتھیوں کا قلعہ باندھا، ہودجوں اور عماریوں میں ہتھیار بند سپاہی بٹھائے۔ میمنہ و میسرہ کے پیچھے قلعہ کے طور پر ہاتھوں کے پرے جمائے۔ خبر رسانی کے لیے موقع جنگ سے پایہ تخت تک کچھ فاصلے پر آدمی بٹھا دیے۔ جو واقعہ پیش آتا تھا موقع جنگ کا آدمی چلا کر کہتا تھا اور درجہ بدرجہ مدائن تک خبر پہنچ جاتی تھی۔

قادسیہ میں ایک قدیم شاہی محل تھا جو عین میدان کے کنارے پر واقع تھا۔ سعدؓ کو چونکہ عرق النساء کی شکایت تھی اور چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ اس لیے فوج میں شریک نہ ہو سکے، بالاخانے پر میدان کی طرف رخ کر کے تکیہ کے سہارے بیٹھے اور خالد بن عرطفہ کو اپنے بجائے سپہ سالار مقرر کیا۔ تاہم فوج کو لڑاتے خود تھے یعنی جس وقت جو حکم دینا مناسب ہوتا تھا پرچوں پر لکھ کر اور گولیاں بنا کر خالد کی طرف پھینکتے جاتے تھے اور خالد انہی روایتوں کے موافق موقع بہ موقع لڑائی کا اسلوب بدلتے جاتے تھے۔ تمدن کے ابتدائی زمانے میں فن جنگ کا اس قدر ترقی کرنا تعجب کے قابل اور عرب کی تیزی طبع اور لیاقت جنگ کی دلیل ہے۔

فوجیں آراستہ ہو چکیں تو عرب کے مشہور شعراء اور خطیب صفوں سے نکلے اور اپنی آتش فشانی سے تمام فوج میں آگ لگا دی۔ شعراء میں شماخ، حطیئہ، اوس بن مغراء، عبدۃ بن الطبیب، عمرو بن معدی کرب اور خطیبوں میں قیس بن ہبیرہ، غالب ابن الہذیل الاسدی، بسر بن ابی رہم الجہنی، عاصم بن عمرو، ربیع معدی، ربعی بن عامر میدان میں کھڑے تقریریں کر

نشاندہی آج ممکن نہیں۔ موجودہ قادسیہ شہر، کوفہ سے تقریباً ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے

رہے تھے اور فوج کا یہ حال تھا کہ ان پر کوئی جادو کر رہا ہے۔ ان تقریروں کے بعض جملے یاد رکھنے کے قابل ہیں:

ابن الہذیل الاسدی کے الفاظ یہ تھے:

يَا مَعَاشِرَ سَعْدٍ، اجْعَلُوا حُصُونَكُمُ السُّيُوفَ، وَكُونُوا عَلَيْهِمْ كَأُسُودِ الأَجَمِ، وَتَرَبَّدُوا لَهُمْ تَرَبُّدَ النُّمُورِ، وَادَّرِعُوا الْعَجَّاجَ، وَثِقُوا بِاللَّهِ وَغُضُّوا الأَبْصَارَ، فَإِذَا كَلَّتِ السُّيُوفُ فَإِنَّهَا مَأْمُورَةٌ، فَأَرْسِلُوا عَلَيْهِمُ الْجَنَادِلَ، فَإِنَّهَا يُؤْذَنَ لَهَا فِيمَا لا يُؤْذَنُ لِلْحَدِيدِ فِيهِ.[1]

"خاندان سعد! تلواروں کو قلعہ بناؤ اور دشمنوں کے مقابلے میں شیر بن جاؤ۔ اور چیتے کی طرح ان پر لپکو۔ گرد کی زرہ پہن لو اور نگاہیں نیچی کر لو۔ جب تلواریں تھک جائیں تو تیروں کی باگ چھوڑ دو کیونکہ تیروں کو جہاں بار مل جاتا ہے تلواروں کو نہیں ملتا"۔

اس کے ساتھ قاریوں نے میدان میں نکل کر نہایت خوش الحانی اور جوش سے جہاد کی آیتیں پڑھنی شروع کیں۔ جس کی تاثیر سے دل دہل گئے اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

سعدؓ نے قاعدے کے موافق نعرے لگائے اور چوتھے پر لڑائی شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے ایک ایرانی قدر انداز دیبا کی قبا زیب بدن کیے، زریں کمر بند لگائے ہاتھوں میں سونے کے کڑے پہنے میدان میں آیا۔ ادھر سے عمرو معدی کرب اس کے مقابلے کو نکلے۔ اس نے تیر کمان میں جوڑا اور ایسا تاک کر مارا کہ یہ بال بال بچ گئے۔ انہوں نے گھوڑے کو دبایا اور قریب پہنچ کر کمر بند میں ہاتھ ڈال کر معلق اٹھا زمین پر دے پٹکا اور تلوار سے گردن اڑا کر فوج کی طرف مخاطب ہوئے کہ یوں لڑا کرتے ہیں۔ لوگوں نے کہا: ہر شخص معدی کرب کیونکر ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اور بہادر دونوں طرف سے نکلے اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔ پھر عام جنگ شروع ہوئی۔ ایرانیوں نے بجیلہ کے رسالہ پر جو سب سے ممتاز تھا، ہاتھیوں کو ریلا۔ عرب کے گھوڑوں نے یہ کالے پہاڑ دیکھے تو دفعتاً بدکے اور منتشر ہو گئے۔ پیدل فوج ثابت قدمی سے لڑی لیکن ہاتھیوں کے ریلے میں ان کے پاؤں اکھڑ جاتے تھے۔ سعدؓ نے یہ ڈھنگ دیکھ کر فوراً قبیلہ اسد کو حکم بھیجا کہ بجیلہ کو سنبھالو۔ طلیحہ نے جو قبیلہ کے سردار اور مشہور بہادر

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک، ۲: ۴۰۹

تھے، ساتھوں سے کہا: عزیزو! سعدؓ نے کچھ سمجھ کر تم سے مدد مانگی ہے۔ تمام قبیلے نے جوش میں آکر باگیں اٹھائی اور ہاتھوں میں برچھیاں لے کر ہاتھیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ان کی پامردی سے اگرچہ کالی آندھی ذرا تھم گئی لیکن ایرانیوں نے بجیلہ کو چھوڑ کر سارا زور اس طرف کر دیا۔ سعدؓ نے قبیلہ تمیم کو جو قدر اندازی اور نیزہ بازی میں مشہور تھے، کہلا بھیجا کہ تم سے ہاتھوں کی کچھ تدبیر نہیں ہو سکتی؟ یہ سن کر وہ دفعتاً بڑھے اور اس قدر تیر برسائے کہ فیل نشینوں کو گرا دیا۔ پھر قریب پہنچ کر تمام ہودے اور عماریاں الٹ دیں۔ شام تک یہ ہنگامہ رہا۔ جب بالکل تاریکی چھا گئی تو دونوں حریف میدان سے ہٹے۔ قادسیہ کا یہ پہلا معرکہ تھا اور عربی میں اس کو یوم الارماث کہتے ہیں۔

سعدؓ جس وقت بالاخانے پر بیٹھے فوج کو لڑا رہے تھے، ان کی بیوی سلمیٰؓ بھی ان کے برابر بیٹھی تھیں۔ ایرانیوں نے جب ہاتھیوں کو ریلا تو مسلمان پیچھے ہٹے تو سعدؓ غصے کے مارے بیتاب ہوئے جاتے تھے اور بار بار کروٹیں بدلتے تھے۔ سلمیٰؓ یہ حالت دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھی کہ افسوس آج مثنیٰؓ نہ ہوا۔ سعدؓ نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا کہ مثنیٰؓ ہوتا تو کیا کر لیتا۔ سلمیٰؓ نے کہا سبحان اللہ بزدلی کے ساتھ غیرت بھی۔ یہ اس بات پر طعن تھا کہ سعدؓ خود لڑائی میں شریک نہ تھے۔

اگلے دن سعدؓ نے سب سے پہلے میدان جنگ سے مقتولوں کی لاشیں اٹھوا کر دفن کرائیں اور جس قدر زخمی تھے مرہم پٹی کے لیے عورتوں کے حوالے کیے۔ پھر فوج کو کمر بندی کا حکم دیا، لڑائی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ شام کی طرف سے غبار اٹھا۔ گرد چھٹی تو معلوم ہوا کہ ابوعبیدہؓ نے شام سے جو امدادی فوجیں بھیجی تھیں وہ آ پہنچیں۔ حضرت عمرؓ نے جس زمانے میں عراق پر حملے کی تیاریاں کی تھیں، اسی زمانے میں ابوعبیدہؓ کو جو شام کی مہم پر مامور تھے، لکھ بھیجا تھا کہ عراق کی جو فوج وہاں بھیجی گئی تھی اس کو حکم دو کہ سعدؓ کی فوج سے جا کر مل جائے۔ چنانچہ عین وقت پر یہ فوج پہنچی اور تائید غیبی سمجھی گئی۔ یہ چھ ہزار سپاہی تھے جن میں پانچ ہزار ربیعہ و مضر اور ہزار خاص حجاز کے تھے۔ ہاشم بن عتبہ (سعدؓ کے بھائی) سپہ سالار تھے اور ہراول قعقاع رکاب میں تھا۔ قعقاع نے پہنچتے ہی صف سے نکل کر پکارا کہ ایرانیوں میں کوئی بہادر ہو تو مقابلے پر آئے۔ ادھر سے بہمن نکلا۔ قعقاع جسر کا واقعہ یاد کر کے پکار اٹھے کہ لینا ابوعبیدہ کا قاتل جانے نہ پائے۔ دونوں حریف تلوار لے کر مقابل ہوئے اور کچھ

دیر کی ردوبدل کے بعد بہمن مارا گیا۔ دیر تک دونوں طرف سے بہادر تنہا تنہا میدان میں نکل کر شجاعت کے جوہر دکھاتے رہے۔ سیستان کا شہزادہ براز، اعور بن قطبہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بزرجمہر ہمدانی جو ایک مشہور بہادر تھا، قعقاع سے لڑ کر قتل ہوا۔ غرض ہنگامہ عام ہونے سے پہلے ایرانی فوج نے اکثر اپنے نامور بہادر کھو دیے۔ تاہم بڑے زور و شور سے دونوں فوجیں حملہ آور ہوئیں۔

شام کی امدادی فوج کی قعقاع نے اس تدبیر سے روانہ کیا تھا کہ چھوٹے چھوٹے دستے کر دیے تھے اور جب ایک دستہ میدان جنگ میں پہنچ جاتا تھا تو دوسرا دور سے نمودار ہوتا تھا۔ اس طرح تمام دن فوجوں کا تانتا بندھا رہا اور ایرانیوں پر خوف چھاتا رہا۔ ہر دستہ اللہ اکبر کے نعرے مارتا ہوا آتا تھا اور قعقاع اس کے ساتھ ہو کر دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے۔

ہاتھیوں کے لیے قعقاع نے یہ تدبیر کی کہ اونٹوں پر جھول اور برقع ڈال کر ہاتھیوں کی طرح مہیب بنایا، یہ مصنوعی ہاتھی جس طرف رخ کرتے تھے ایرانیوں کے گھوڑے بدک کر سواروں کے قابو سے نکل جاتے تھے۔

عین ہنگامہ جنگ میں حضرت عمرؓ کے قاصد پہنچے جن کے ساتھ نہایت بیش قیمت عربی گھوڑے اور تلواریں تھیں۔ ان لوگوں نے فوج کے سامنے پکار کر کہا کہ امیر المومنین نے یہ انعام ان لوگوں کے لیے بھیجا ہے جو اس کا حق ادا کر سکیں۔ چنانچہ قعقاع نے حمال بن مالک، ربیل بن عمرو، طلیحہ بن خویلد، عاصم بن عمرو التمیمی کو تلواریں حوالہ کیں اور قبیلہ یربوع کے چار بہادروں کو گھوڑے عنایت کیے۔ ربیل نے فخر اور جوش میں آکر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

لقد علم الأقوام أنا أحقهم

إذا حصلوا بالمرهفات البواتر[1]

"سب لوگوں کو معلوم ہے کہ میں سب سے زیادہ مستحق ہوں جس وقت لوگوں نے کاٹنے والی نازک تلواریں پائیں"۔[2]

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲: ۴۱۴

[2] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۱۶۲ تا ۱۶۸

اس دن مسلمان دو ہزار اور ایرانی دس ہزار مقتول و مجروح ہوئے۔ تاہم فتح و شکست کا کچھ فیصلہ نہ ہوا یہ معرکہ اغواث کے نام سے مشہور ہے۔

تیسرا معرکہ یوم العماس کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قعقاع نے یہ تدبیر کی کہ رات کے وقت چند رسالوں اور پیدل فوج کو حکم دیا کہ پڑاؤ سے دور شام کی طرف نکل جائیں۔ پو پھٹے سو سو سوار میدان جنگ کی طرف گھوڑے اڑاتے ہوئے آئیں۔ اور رسالے اسی طرح برابر آتے جائیں۔ چنانچہ صبح ہوتے ہوتے پہلا رسالہ پہنچا۔ تمام فوج نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ اور غُل پڑ گیا کہ نئی امدادی فوجیں آ گئیں، ساتھ ہی حملہ ہوا۔ حسن اتفاق یہ کہ ہشام، جن کو ابو عبیدہ نے شام سے مدد کے لئے بھیجا تھا، عین موقع پر سات سو سواروں کے ساتھ پہنچ گئے۔ یزدگرد کو دم دم کی خبریں پہنچتی تھیں اور وہ اور فوجیں بھیجتا جاتا تھا۔ ہشام نے فوج کی طرف خطاب کیا اور کہا تمہارے بھائیوں نے شام کو فتح کر لیا ہے اور فارس کی فتح کا جو اللہ کی طرف سے وعدہ ہے وہ تمہارے ہاتھ سے پورا ہو گا۔ معمول کے موافق جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ ایرانیوں کی فوج سے ایک پہلوان شیر کی طرح دھاڑتا ہوا میدان میں آیا۔

اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر لوگ اس کے مقابلے سے جی چراتے تھے۔ لیکن ایک عجیب اتفاق سے وہ ایک کمزور سپاہی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ایرانیوں نے تجربہ اٹھا کر ہاتھیوں کے دائیں بائیں پیدل فوجیں قائم کر دی تھیں۔ عمرو معدی کرب نے رفیقوں سے کہا کہ میں مقابل کے ہاتھی پر حملہ کرتا ہوں تم ساتھ رہنا، ورنہ عمرو معدی کرب مارا گیا تو پھر معدی کرب پیدا نہ ہو گا۔ یہ کہہ کر تلوار میان سے گھسیٹ لی اور ہاتھی پر حملہ کیا لیکن پیدل فوجیں جو دائیں بائیں تھیں دفعتاً ان پر ٹوٹ پڑیں اور اس قدر گرد اٹھی کہ یہ نظر سے چھپ گئے۔ یہ دیکھ کر ان کی فوج حملہ آور ہوئی اور بڑے معرکے کے بعد دشمن پیچھے ہٹے۔ عمرو معدی کرب کا یہ حال تھا کہ تمام جسم خاک سے اٹا ہوا تھا۔ بدن پر جابجا برچھیوں کے زخم تھے۔ تاہم تلوار قبضے میں تھی اور ہاتھ چلتا جاتا تھا۔ اسی حالت میں ایک ایرانی سوار برابر سے نکلا انہوں نے اس کے گھوڑے کی دم پکڑ لی، ایرانی نے بار بار مہمیز کیا لیکن گھوڑا جگہ سے ہل نہ سکا۔ آخر سوار اتر کر بھاگ نکلا اور یہ اچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھے۔

سعدؓ نے یہ دیکھ کر کہ ہاتھی جس طرف رخ کرتے ہیں دل کا دل پھٹا جاتا ہے۔ ضخم و سلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے بلا کر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے؟

انہوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر تھے اور گویا کہ ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعدؓ نے قعقاع، عاصم، حمال، ربیل کو بلا کر کہا کہ یہ مہم تمہارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے کچھ سوار اور پیادے بھیج دیے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کر لیں، پھر خود برچھا ہاتھ میں لے کر پہلے سفید یا تھی کی طرف بڑھے، عاصم بھی ساتھ تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ ہاتھی جھرجھری لے کر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔ ادھر ربیل اور جمال نے اجرب پر حملہ کیا۔ وہ زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہو لیے اور دم کی دم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا۔

اب بہادروں کو حوصلہ آزمائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گرج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اس معرکے کو لیلۃ الہریر کہتے ہیں۔ ایرانیوں نے فوج نئے سرے سے ترتیب دی۔ قلب میں اور دائیں بائیں تیرہ تیرہ صفیں قائم کیں۔ مسلمانوں نے بھی تمام فوج کو سمیٹ کر یکجا کیا اور آگے پیچھے تین پرے جمائے۔ سب سے آگے سواروں کا رسالہ، ان کے بعد پیدل فوجیں اور سب سے پیچھے تیر انداز۔ سعدؓ نے حکم دیا تھا کہ تیسری تکبیر پر حملہ کیا جائے لیکن ایرانیوں نے جب تیر برسانے شروع کیے تو قعقاع سے ضبط نہ ہو سکا اور اپنے رکاب کی فوج لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ فوجی اصول کے لحاظ سے یہ حرکت نافرمانی میں داخل تھی۔ تاہم لڑائی کا ڈھنگ اور قعقاع کا جوش دیکھ کر سعدؓ کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اللّٰھم اغفرلہ وانصرہ یعنی اے اللہ قعقاع کو معاف کرنا اور اس کا مددگار رہنا۔ قعقاع کو دیکھ کر بنو اسد اور بنو اسد کی دیکھا دیکھی نخع، بجیلہ، کندہ سب ٹوٹ پڑے۔ سعدؓ ہر قبیلے کے حملے پر کہتے جاتے تھے کہ خدایا اس کو معاف کرنا اور اس کا مددگار رہنا۔ اول اول سواروں کے رسالے نے حملہ کیا لیکن ایرانی فوجیں جو دیوار کی طرح جمی کھڑی تھیں اس ثابت قدمی سے لڑیں کہ گھوڑے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ دیکھ کر سب گھوڑوں سے کود پڑے اور پیادہ حملہ آور ہوئے۔

شبلی نعمانی مزید لکھتے ہیں:

ایرانیوں کا ایک رسالہ سر تا پا لوہے میں غرق تھا۔ قبیلہ حمضہ نے اس پر حملہ کیا لیکن تلواریں زرہوں پر اچٹ اچٹ کر رہ گئیں۔ سردار قبیلہ نے للکارا۔ سب نے کہا زرہوں پر تلواریں کام نہیں دیتیں۔ اس نے غصے میں آکر ایک ایرانی پر برچھے کا وار کیا کہ کمر توڑ کر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر اوروں کو بھی ہمت ہوئی اور اس بہادری سے لڑے کہ رسالہ کا رسالہ برباد ہو گیا۔

تمام رات ہنگامہ کارزار گرم رہا، لوگ لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو گئے تھے اور نیند کے خمار میں ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے جاتے تھے۔ اس پر بھی جب فتح و شکست کا فیصلہ نہ ہوا تو قعقاع نے سرداران قبائل میں سے چند نامور بہادر انتخاب کیے اور سپہ سالار فوج (رستم) کی طرف رخ کیا۔ ساتھ ہی قیس، اشعث، عمرو معدی کرب، ابن ذی البر دین نے جو اپنے قبیلے کے سردار تھے، ساتھیوں کو للکارا کہ دیکھو! یہ لوگ اللہ کی راہ میں تم سے آگے نکلنے نہ پائیں اور سرداروں نے بھی جو بہادری کے ساتھ زبان آور بھی تھے، اپنے قبیلوں کے سامنے کھڑے ہو کر اس جوش سے تقریریں کیں کہ تمام لشکر میں ایک آگ لگ گئی۔ سوار گھوڑوں سے کود پڑے۔ اور تیر و کمان پھینک کر تلواریں گھسیٹ لیں۔ اس جوش کے ساتھ تمام فوج سیلاب کی طرح بڑھی اور فیروزن و ہرمزان کو دباتے ہوئے رستم کے قریب پہنچ گئی۔ رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ وار لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چور ہو گیا تو بھاگ چلا۔ ہلال نامی ایک سپاہی نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آگئی۔ رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے۔ ساتھ ہی ہلال بھی کود ے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔ ہلال نے لاش خچروں کے پاؤں میں ڈال دی اور تخت پر چڑھ کر پکارے کہ رستم کا میں نے خاتمہ کر دیا۔[1]

علامہ بلاذری نے لکھا ہے کہ

وقتل الله رستم فوجد بدنه مملوءا ضربا وطعنا فلم يعلم من قاتله وقد كان مشى إليه عمرو بن معدى كرب وطليحة بن خويلد الأسدي وقرط بن جماح العبدي وضرار بن الأزور الأسدي[2]

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۱۷۴ تا ۱۷۵

[2] بلاذری، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۳ھ، ص ۲۵۹

اللہ نے رستم کو قتل کر دیا اس کا جسم خنجر کے زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ رستم کے قاتل کا نام معلوم نہیں لیکن عمرو معدی کرب، طلیحہ بن خویلد، قرط بن جماع اور ضرار بن ازور اسدی نے اس پر حملہ کیا تھا۔

ابو حنیفہ دینوری نے لکھا:

وبه مائه جراحه[1]

رستم کو دوران جنگ سو زخم لگے۔

ایرانیوں نے دیکھا تو تخت سپہ سالار سے خالی تھا۔ تمام فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ مسلمانوں نے دور تک تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں۔

شکست کے بعد بھی چند نامور افسر جو ریاستوں کے مالک تھے میدان میں ثابت قدم رہے۔ ان میں سے شہریار، ابن الہربد، فرخان اہوازی، خسرو شنوم ہمدانی نے مردانہ وار جان دی لیکن ہرمزان، اہود، قارن موقع پا کر بھاگ نکلے۔ ایرانیوں کے کشتوں کا تو شمار نہ تھا مسلمان بھی کم و بیش چھ ہزار کام آئے۔

اس فتح میں چونکہ سعدؓ خود شریک جنگ نہ تھے فوج کو ان کی طرف سے بدگمانی رہی۔ یہاں تک کہ ایک شاعر نے کہا:

نُقَاتِلُ حَتَّى يُنْزِلَ اللهُ نَصْرَهُ
وَسَعْدٌ بِبَابِ الْقَادِسِيَّةِ مُعْصِمُ
فَأُبْنَا وَقَدْ آمَتْ نِسَاءٌ كَثِيرَةٌ
وَنِسْوَةُ سَعْدٍ لَيْسَ فِيهِنَّ أَيِّمُ[2]

"ہم مسلسل لڑتے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد بھیجی لیکن سعد قادسیہ کے دروازے سے لپٹے رہے"۔

"ہم واپس پھرے تو سینکڑوں عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں لیکن سعدؓ کی کوئی بیوی بیوہ نہیں ہوئی۔"

---

[1] ابو حنیفہ دینوری، الاخبار الطوال، دار احیاء الکتب العربی، القاہرۃ، ص ۱۲۳

[2] طبرانی، المعجم الکبیر، مکتبہ زہراء، موصل، ۱: ۱۴۱، رقم: ۳۱۰؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۷: ۴۵

یہ اشعار اسی وقت بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئے۔ یہاں تک کہ سعدؓ نے تمام فوج کو جمع کر کے آبلوں کے زخم دکھائے اور معذوری ثابت کی۔

سعدؓ نے حضرت عمرؓ کو نامہ فتح لکھا اور دونوں طرف کے مقتولوں کی تفصیل لکھی۔ حضرت عمرؓ کا یہ حال تھا کہ جس دن سے قادسیہ کا معرکہ شروع ہوا تھا ہر روز آفتاب نکلتے مدینے جاتے اور قاصد کی راہ دیکھتے۔ ایک دن معمول کے مطابق نکلے، ادھر سے ایک شتر سوار آرہا تھا۔ بڑھ کر پوچھا کہ کدھر سے آتے ہو؟ وہ سعدؓ کا قاصد تھا اور مژدہ فتح لے کر آیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ سعدؓ کا قاصد ہے تو اس سے حالات پوچھنے شروع کیے۔ اس نے کہا اللہ نے مسلمانوں کو کامیاب کیا۔ حضرت عمرؓ رکاب کے برابر دوڑے جاتے تھے اور حالات پوچھتے جاتے تھے۔ شتر سوار شہر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ جو شخص سامنے سے آتا ہے ان کو امیر المومنین کے لقب سے پکارتا ہے، ڈر سے کانپ اٹھا کہ حضرت نے مجھ کو اپنا نام کیوں نہ بتایا کہ میں اس گستاخی کا مرتکب نہ ہوتا۔ فرمایا نہیں کچھ حرج نہیں تم سلسلہ کلام کو نہ توڑو چنانچہ اسی طرح اس کے رکاب کے ساتھ ساتھ گھر تک آئے۔ مدینے میں پہنچ کر مجمع عام میں فتح کی خوشخبری سنائی اور ایک نہایت پر اثر تقریر کی جس کا اخیر یہ فقرہ تھا کہ مسلمانوں میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو غلام بنانا چاہتا ہوں، میں خود اللہ کا غلام ہوں، البتہ خلافت کا بار میرے سر پر رکھا گیا ہے۔ اگر میں اس طرح تمہارا کام کروں کہ تم چین سے گھروں میں سوؤ تو میری سعادت یہ ہے اور اگر میری یہ خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو تو میری بدبختی ہے۔ میں تم کو تعلیم دینا چاہتا ہوں لیکن قول سے نہیں بلکہ عمل سے۔[1]

اشرس نے اس کے بیان کی تصدیق کی اور کہا کہ دو سو جانباز میرے ساتھ ہوں تو شہر فوراً فتح ہو جائے۔ ابو موسیٰؓ نے فوج کی طرف دیکھا۔ دو سو بہادروں نے بڑھ کر کہا کہ اللہ کی راہ میں ہماری جان حاضر ہے۔ اشرس اسی تہہ خانے کی راہ شہر پناہ کے دروازے پر پہنچے اور پہرہ والوں کو تہہ تیغ کر کے اندر کی طرف سے دروازے کھول دیئے۔ ادھر ابو موسیٰؓ فوج کے ساتھ موقع پر موجود تھے۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ تمام لشکر ٹوٹ پڑا اور شہر میں ہلچل پڑ گئی۔ ہرمزان نے بھاگ کر قلعے میں پناہ لی۔ مسلمان قلعے کے نیچے پہنچے تو اس نے برج پر چڑھ کر کہا

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۱۷۵ تا ۱۷۷

کہ میرے ترکش میں اب بھی سو تیر ہیں اور جب تک اتنی ہی لاشیں یہاں نہ بچھ جائیں میں گرفتار نہیں ہو سکتا۔ تاہم میں اس شرط پر اتر آتا ہوں کہ تم مجھ کو مدینہ پہنچا دو اور جو کچھ فیصلہ ہو، عمرؓ کے ہاتھ سے ہو۔ ابو موسیٰؓ نے منظور کیا اور حضرت انسؓ کو مامور کیا کہ مدینہ تک اس کے ساتھ جائیں۔ ہرمزان بڑی شان و شوکت سے روانہ ہوا۔ بڑے بڑے رئیس اور خاندان کے تمام آدمی رکاب میں لئے۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر شاہانہ ٹھاٹھ سے آراستہ ہوا۔ تاج مرصع جو آذین کے لقب سے مشہور تھا، سر پر رکھا۔ دیبا کی قبا زیب بدن کی، شاہان عجم کے طریقے کے موافق زیور پہنے۔ کمر سے مرصع تلوار لگائی۔ غرض شان و شوکت کی تصویر بن کر مدینے میں داخل ہوا اور لوگوں سے پوچھا کہ امیر المومنین کہاں ہیں؟ وہ سمجھتا تھا کہ جس شخص کے دبدبہ نے تمام دنیا میں غلغلہ ڈال رکھا ہے، اس کا دربار بھی بڑے سر و سامان کا ہو گا۔ حضرت عمرؓ اس وقت مسجد میں تشریف رکھتے تھے اور فرش خاک پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہرمزان مسجد میں داخل ہوا تو سینکڑوں تماشائی ساتھ تھے جو اس کے زرق برق لباس کو بار بار دیکھتے تھے اور تعجب کرتے تھے۔ لوگوں کی آہٹ سے حضرت عمرؓ کی آنکھ کھلی تو عجمی شان و شوکت کا مرقع سامنے تھا۔ اوپر سے نیچے تک دیکھا اور حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "یہ دنیائے دوں کی دل فریبیاں ہیں"۔ اس کے بعد ہرمزان کی طرف مخاطب ہوئے، اس وقت تک مترجم نہیں آیا تھا۔ مغیرہ بن شعبہؓ کچھ کچھ فارسی سے آشنا تھے، اس لئے انہوں نے ترجمانی کی۔ حضرت عمرؓ نے پہلے وطن پوچھا۔ مغیرہؓ وطن کی فارسی نہیں جانتے تھے، اس لئے کہا کہ از کدام ارضی؟ پھر اور باتیں شروع ہوئیں۔ قادسیہ کے بعد ہرمزان نے کئی دفعہ سعدؓ سے صلح کی تھی اور ہمیشہ اقرار سے پھر پھر جاتا تھا۔ شوستر کے معرکے میں دو بڑے مسلمان افسر اس کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔[1]

حضرت عمرؓ کو ان باتوں کا اس قدر رنج تھا کہ انہوں نے ہرمزان کے قتل کا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ تاہم اتمام حجت کے طور پر عرض معروض کی اجازت دی۔ اس نے کہا کہ عمرؓ! جب تک اللہ ہمارے ساتھ تھا تم ہمارے غلام تھے، اب اللہ تمہارے ساتھ ہے اور ہم تمہارے غلام ہیں۔ یہ کہہ کر پینے کا پانی مانگا۔ پانی آیا تو پیالہ ہاتھ میں لے کر درخواست کی کہ جب تک پانی نہ

[1] یہ واقعات طبری نے اپنی کتاب تاریخ الامم والملوک میں نہایت تفصیل سے لکھے ہیں: طبری، تاریخ الامم والملوک، ۲: ۵۰۲

پی لوں مارانہ جاؤں۔ حضرت عمرؓ نے منظور کیا۔ اس نے پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں پانی نہیں پیتا اور اس لئے شرط کے موافق تم مجھ کو قتل نہیں کر سکتے۔ حضرت عمرؓ اس مغالطے پر حیران رہ گئے۔ ہرمزان نے کلمہ توحید پڑھا اور کہا میں پہلے ہی اسلام لا چکا تھا لیکن یہ تدبیر اس لئے کی کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ میں نے تلوار کے ڈر سے اسلام قبول کیا۔ حضرت عمرؓ نہایت خوش ہوئے اور خاص مدینہ میں رہنے کی اجازت دی۔[1] اس کے ساتھ دو ہزار سالانہ روزینہ مقرر کر دیا۔ حضرت عمرؓ فارس وغیرہ کی مہمات میں اکثر اس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔[2]

مولانا شبلی نعمانی فتح نہاوند کا احوال یوں لکھتے ہیں:

طلیحہ بن خالد الاسدی کی رائے کے موافق فوجیں آراستہ ہو کر شہر سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ٹھہریں اور قعقاعؓ کو تھوڑی سی فوج دے کر بھیجا کہ شہر پر حملہ آور ہوں۔ عجمی بڑے جوش سے مقابلہ کو نکلے اور اس بندوبست کے لئے کہ کوئی شخص پیچھے نہ ہٹنے پائے، جس قدر بڑھتے آتے تھے، پیچھے گوکھرو بچھاتے آتے تھے۔ قعقاعؓ نے لڑائی چھیڑ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ عجمی برابر بڑھتے چلے آئے یہاں تک کہ گوکھرو کی سرحد سے نکل آئے۔ نعمانؓ نے جو ادھر فوجیں جمار کھی تھیں، موقع کا انتظار کر رہی تھیں۔ جونہی عجمی زور پر آئے، انہوں نے حملہ کرنا چاہا لیکن نعمانؓ نے روکا۔ عجمی جو برابر تیر برسا رہے تھے، اس سے سینکڑوں ہزاروں مسلمان کام آئے لیکن افسر کی یہ اطاعت تھی کہ زخم کھاتے تھے اور ہاتھ روکے کھڑے تھے۔ مغیرہؓ بار بار کہتے تھے کہ فوج بیکار ہوئی جاتی ہے اور موقع ہاتھ سے نکلا جاتا ہے لیکن نعمانؓ اس خیال سے دوپہر کے ڈھلنے کا انتظار کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دشمن پر حملہ کرتے تھے تو اسی وقت کرتے تھے۔ غرض دوپہر ڈھلی تو نعمانؓ نے دستور کے موافق تین نعرے مارے۔ پہلے نعرہ پر فوج سر و سامان سے درست ہو گئی۔ دوسرے پر لوگوں نے تلواریں تول لیں اور تیسرے پر دفعتاً حملہ کیا اور اس بے جگری سے ٹوٹ کر گرے کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ میدان میں اس قدر خون بہا کہ گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ چنانچہ نعمانؓ کا گھوڑا پھسل کر گرا، ساتھ ہی خود بھی گرے

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک، ۲: ۵۰۲

[2] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۲۴۴ تا ۲۴۶

اور زخموں سے چور ہو گئے۔ ان کا امتیازی لباس جس سے وہ معرکے میں پہچانے جاتے تھے، کلاہ اور سفید قبا تھی۔ جونہی وہ گھوڑے سے گرے، نعیم بن مقرن ان کے بھائی نے علم کو جھپٹ کر تھام لیا اور ان کی کلاہ اور قبا پہن کر ان کے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اس تدبیر سے نعمانؓ کے مرنے کا حال کسی کو معلوم نہ ہوا اور لڑائی بدستور قائم رہی۔ اس مبارک زمانے میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے جو ضبط و استقلال دیا تھا، اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ نعمانؓ جس وقت زخمی ہو کر گرے تھے اعلان کر دیا کہ میں مر بھی جاؤں تو کوئی شخص لڑائی کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ نہ ہو۔ اتفاق سے ایک سپاہی ان کے پاس نکلا۔ دیکھا تو کچھ سانس باقی ہے اور دم توڑ رہے ہیں۔ گھوڑے سے اتر کر ان کے پاس بیٹھنا چاہا کہ ان کا حکم یاد آ گیا۔ اسی طرح چھوڑ کر چلا گیا۔ فتح کے بعد ایک شخص سرہانے گیا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کہ کیا انجام ہوا؟ اس نے کہا "مسلمانوں کی فتح ہوئی" اللہ کا شکر ادا کر کے کہا کہ فوراً عمرؓ کو اطلاع دو۔

رات ہوتے ہوتے عجمیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ہمدان تک تعاقب کیا۔

حذیفہ بن الیمانؓ نے جو نعمانؓ کے بعد سر لشکر مقرر ہوئے نہاوند پہنچ کر مقام کیا، یہاں ایک مشہور آتش کدہ تھا، اس کا موبد حذیفہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ مجھ کو امن دیا جائے تو میں ایک متاع بے بہا کا پتہ دوں۔ چنانچہ کسریٰ پرویز کے نہایت بیش بہا جواہرات لا کر پیش کئے جس کو کسریٰ نے مشکل وقتوں کے لئے محفوظ رکھا تھا۔ حذیفہؓ نے مال غنیمت کو تقسیم کیا اور پانچواں حصہ مع جواہرات کے حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت عمرؓ کو ہفتوں سے لڑائی کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ قاصد نے مژدہ فتح سنایا تو بے انتہا خوش ہوئے لیکن جب نعمانؓ کا شہید ہونا سنا تو بے اختیار رو پڑے اور دیر تک سر پر ہاتھ رکھ کر روتے رہے۔ قاصد نے اور شہداء کے نام گنائے اور کہا کہ بہت سے اور لوگ بھی شہید ہوئے جن کو میں نہیں جانتا۔ حضرت عمرؓ پھر روئے اور فرمایا کہ عمرؓ نہ جانے تو نہ جانے لیکن اللہ ان کو جانتا ہے۔ جواہرات کو دیکھ دیکھ کر غصہ سے کہا کہ فوراً واپس لے جاؤ اور حذیفہؓ سے کہو کہ بیچ کر فوج میں تقسیم کر دیں۔ چنانچہ یہ جواہرات چار کروڑ درہم میں فروخت ہوئے۔

بلاذری لکھتے ہیں کہ ابو عثمان نہدی جب فتح کی بشارت لے کر حضرت عمر کے پاس گئے تو حضرت عمر نے نعمان کا کیا ہوا؟ میں نے بتایا کہ شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت عمر نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور رونے لگے۔ میں نے بتایا کہ بخدا اور بھی لوگ شہید ہوئے ہیں جنہیں میں نہیں جانتا تو حضرت عمر نے فرمایا:

ولکن اللہ یعلھم[1]

لیکن اللہ تو ان کو جانتا ہے۔

اس لڑائی میں قریباً تیس ہزار عجمی لڑ کر مارے گئے۔ اس معرکہ کے بعد عجم نے پھر کبھی زور نہیں پکڑا۔ چنانچہ عرب نے اس فتح کا نام فتح الفتوح رکھا۔ فیروز جس کے ہاتھ پر حضرت فاروقؓ کی شہادت لکھی تھی اسی لڑائی میں گرفتار ہوا تھا۔[2]

---

[1] بلاذری، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۳ھ، ص ۳۰۱

[2] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۲۵۲ تا ۲۵۴

(۳)

تمدّن آفریں، خلّاقِ آئینِ جہاں داری

۳۔ تمدن آفریں

اسلام کی آمد انسانیت کے لیے نہ صرف ایک نیا مذہب بلکہ ایک نیا تمدن اور تہذیب تھی۔ تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ اسلامی تہذیب دنیا کی سب سے آخری اور مکمل تہذیب ہے، اور اس کے بعد کوئی ایسی بڑی تہذیب نہیں ابھری جو اسلام کی ہم پلہ ہو سکے۔ اسلام نہ صرف ایک کامل اور مکمل تہذیب ہے بلکہ اس کی تعلیمات انسانیت کے لیے ایسے اعلیٰ اصول فراہم کرتی ہیں جو انسانی فلاح و بہبود کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ اس کے اصولوں کی بنیاد انسانیت کی خدمت اور محبت پر ہے، اور اس میں ہر انسان کے لیے عزت، انصاف، اور برابری کی تعلیم دی گئی ہے۔

اسی لیے، علامہ اقبال نے اپنی نظم میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے آباو اجداد کو تمدن آفریں قرار دیا۔ یہ وہ تمدن تھا جس کی بنیاد علم و حکمت پر تھی، اور اس کا سرچشمہ قرآن حکیم اور سیرت نبوی سے تھا۔ اسلام نے انسانوں کو توہمات اور غیر انسانی رسوم و رواج سے نجات دلائی اور ان کو تحقیق، علم اور شعور کی روشنی سے آشنا کیا۔ اس کے نتیجے میں انسانیت ایک ایسے تمدن کا حصہ بنی جہاں لوگوں نے فطرت کے مظاہر کی عبادت کرنے کے بجائے ان پر غلبہ حاصل کرنے کے راستے اختیار کیے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات کے اثرات ہی تھے جن کی بدولت مسلمانوں نے اپنے دور کی جمود میں مبتلا روایات کے برخلاف، کائنات کا سائنسی اور منطقی مطالعہ شروع کیا۔ قرآن حکیم کی رہنمائی نے مسلمانوں میں علمی اور سائنسی تحقیق کا آغاز کیا،

اور اس حوالے سے فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) نے لکھا ہے کہ قرآن کا کردار مسلمانوں میں علمی و سائنسی روایت کے آغاز میں نہایت اہم تھا۔ قرآن نے نہ صرف انسانوں کو علم کی جستجو کی ترغیب دی بلکہ کائنات کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے اندر حکمت تلاش کرنے کی رہنمائی بھی فراہم کی۔ اس طرح، اسلام نے نہ صرف ایک روحانی تمدن قائم کیا بلکہ علمی، سائنسی، اور تہذیبی سطح پر بھی انسانوں کی فلاح کی بنیاد رکھی جو آج تک ایک بے مثل اور بلند معیار کے طور پر موجود ہے۔ مسلمانوں میں علمی اور سائنسی روایت کے آغاز میں قرآن حکیم کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) لکھتا ہے:

> The attention and interest of the Moslem Arabs were drawn quite early to those branches of learning motivated by the religious impulse. The necessity of comprehending and explaining the Koran soon became the basis of intensive theological as well as linguistic study.[1]

"بہت اوائل سے ہی مسلمان عربوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز وہ علوم قرار پائے جن کے حصول کی ترغیب دین میں موجود تھی۔ قرآن حکیم کی تفہیم اور تشریح کی ضرورت جلد ہی وسیع مذہبی اور لسانیاتی مطالعہ کی بنیاد بن گئی۔"

فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) نے مسلمانوں میں علمی اور سائنسی رجحانات کے فروغ کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث کی برکتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات نے مسلمانوں کے دلوں میں علم کی جستجو اور تحقیق کا جو جذبہ پیدا کیا، وہ نہ صرف مذہبی احکام تک محدود رہا بلکہ اس نے سائنسی تحقیق کی جانب بھی مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

فلپ ہٹی نے واضح طور پر یہ ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث میں علم حاصل کرنے کی اہمیت پر بے شمار مرتبہ زور دیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ "علم ہر مسلمان پر فرض ہے"، اور اس کے ساتھ ہی آپ نے دنیا کے مختلف علوم کی طرف مسلمانوں کو راغب کیا۔ یہ تعلیمات مسلمانوں کو نہ صرف مذہبی علم کے حصول کی

---

[1] Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, p. 393.

ترغیب دیتی تھیں بلکہ انہوں نے فطرت اور کائنات کے مظاہر کا بھی سائنسی مطالعہ کرنے کی طرف راغب کیا۔

مسلمانوں نے ان تعلیمات کو اپنانا شروع کیا اور ان کی فکر و تحقیق کی بنیاد قرآن و سنت پر رکھی، جس کی بدولت نہ صرف مذہبی بلکہ سائنسی میدان میں بھی عظیم ترقیات ہوئیں۔ یہ علمی رجحانات صرف مسلمان علماء تک محدود نہیں تھے بلکہ عام مسلمانوں کے اندر بھی تحقیق اور تجربہ کرنے کا جذبہ بیدار ہوا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے فلکیات، طب، ریاضی، کیمیا، اور دیگر سائنسی میدانوں میں بے شمار اہم کامیابیاں حاصل کیں۔

فلپ ہٹی نے اس بات کو بھی اہمیت دی ہے کہ یہ علمی اور سائنسی کامیابیاں کسی محض تصادف کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ اس کا بنیادی سبب وہ روحانی اور فکری رہنمائی تھی جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث میں موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ علم صرف دنیا کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی رضا اور کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کے لیے بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس علمی تحریک نے مسلمانوں کو ایک روشن راستہ دکھایا جس کی بدولت انہوں نے نہ صرف اپنی تہذیب و تمدن کو نیا رخ دیا بلکہ دنیا بھر میں سائنسی اور فکری ترقی کی بنیاد بھی رکھی۔ فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) لکھتا ہے:

> Arab interest in the curative science found expression in the prophetic tradition that made science twofold: theology and medicine. The physician wat at the same time metaphysician, philosopher and sage and the title Hakim was indifferently applied to him in all these capacities.[1]

''علم الطب میں مسلمانوں کی دلچسپی کا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث میں اس علم کا ذکر ہے۔ جس سے یہ علم دونوعی اہمیت کا حامل ہو گیا: حکمت دین اور علم طب۔ ایک طبیب بیک وقت مابعد الطبعیات کا ماہر، فلسفی اور دانشور ہوتا تھا۔ اور 'حکیم' کے لقب کا اطلاق ان تمام حیثیتوں پر یکساں تھا۔''

---

1 Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, p. 364.

یہ ایک مسلمہ اور اٹل تاریخی حقیقت ہے کہ عالم اسلام کی جملہ علمی، سائنسی، اور ثقافتی ترقی دراصل حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت طیبہ کے فیضان کا نتیجہ تھی۔ آپ کی زندگی اور تعلیمات نے امت مسلمہ کو نہ صرف روحانی بلندیوں کی طرف رہنمائی فراہم کی بلکہ اس نے دنیا کو علم و حکمت کی نئی روشنی سے آشنا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت میں انسانی فلاح اور ترقی کے وہ اصول موجود تھے جو نہ صرف مذہب کی حدود میں رہ کر بلکہ ساری انسانیت کے لیے فکری اور سائنسی ترقی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

امت مسلمہ کی عظمت اور اس کی تہذیبی و علمی کامیابیاں دراصل اسی کتاب سیرت کا ایک باب ہیں جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زندگی سے رقم کیا۔ آپ کی تعلیمات اور ہدایات نے مسلمانوں کو علم کے حصول کی اہمیت سے آگاہ کیا، اور انہیں تحقیق، تجزیے اور علمی کوششوں کی طرف مائل کیا۔ یہی علم و حکمت کا فیضان بعد میں دیگر اقوام تک منتقل ہوا اور مغربی دنیا نے بھی اس علم سے استفادہ کیا۔

مغرب کے معروف مؤرخ اور محقق رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) اس حقیقت کو بخوبی تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام کے علم و حکمت کے ذخیرے نے نہ صرف مسلم دنیا کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا بلکہ اس کے اثرات مغربی تہذیب پر بھی مرتب ہوئے۔ بریفالٹ کا کہنا ہے کہ مغرب میں سائنسی، فلسفیانہ اور ثقافتی ترقی میں جو اہم مرحلے آئے، ان کی جڑیں اسلام کے ابتدائی دور میں موجود تھیں۔ مسلمانوں نے نہ صرف مذہب اور روحانیت کو بلندی بخشی بلکہ سائنسی تحقیق اور دانشوری کے میدان میں بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کیں، جو بعد ازاں مغرب میں بھی نئے افکار کی بنیاد بنیں۔

اسلام نے انسانوں کو توہمات اور غیر عقلی تصورات سے آزاد کر کے سائنسی اور تحقیقی سوچ کی طرف راغب کیا۔ یہی تبدیلی مسلمانوں کی علمی، سائنسی، اور ثقافتی ترقی کا سبب بنی، اور اس کے اثرات آج تک دنیا بھر کی تہذیبوں پر نظر آتے ہیں۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) نے لکھا:

It is highly probable that but for the Arabs, modern European civilisation would never arisen; it is certain that but for them character which has enabled it to transcend all previous phases of evolution. For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is not traceable, nowhere is it so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the paramount distinctive force of the modern world and the supreme source of its victory, natural science and the scientific spirit. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of enquiry, of new methods of investigation, experiment, observation and measurement of the development of mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs.[1]

''اِس بات کا غالب اِمکان ہے کہ عرب مشاہیر سے خوشہ چینی کئے بغیر جدید یورپی تہذیب دورِ حاضر کا وہ اِرتقائی نقطۂ عروج کبھی حاصل نہیں کر سکتی تھی جس پر وہ آج فائز ہے۔ یوں تو یورپی فکری نشو و نما کے ہر شعبے میں اِسلامی ثقافت کا اثر نمایاں ہے لیکن سب سے نمایاں اثر یورپی تہذیب کے اُس مقتدِر شعبے میں ہے جسے ہم تسخیرِ فطرت اور سائنسی وِجدان کا نام دیتے ہیں۔ یورپ کی سائنسی ترقی کو ہم جن عوامل کی وجہ سے پہچانتے ہیں وہ 'جستجو'، 'تحقیق'، 'تحقیقی ضابطے'، 'تجربات'، 'مُشاہدات'، 'پیمائش' اور 'حسابی مُوشگافیاں' ہیں۔ یہ سب چیزیں یورپ کو معلوم تھیں اور نہ یونانیوں کو، یہ سارے تحقیقی اور فکری عوامل عربوں کے حوالے سے یورپ میں متعارف ہوئے۔''

جوزف شاخت(Joseph Schacht) ، جو یورپ کی سائنسی فکر اور مغربی علم و تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کرنے والے ایک معروف محقق ہیں، نے اسلام کی سائنسی فکر کے اثرات اور مغرب کی علمی نشاۃِ ثانیہ پر اسلام کے اثرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ شاخت نے اپنے تجزیے میں واضح طور پر بیان کیا ہے کہ یورپ کی علمی ترقی اور سائنسی فکر کی

---

1 Dr. Robert Briffault, *Rational Evolution: The Making of Humanity*, pp. 190-191.

نئی جہتیں دراصل اسلامی تہذیب سے مستعار ہیں، خاص طور پر وہ علم جو مسلمانوں نے فلکیات، ریاضی، طب، کیمیا، اور فلسفہ کے میدانوں میں حاصل کیا تھا۔

انہوں نے لکھا کہ مغربی دنیا کی علمی نشاۃِ ثانیہ میں جو ایک نیا فکری انقلاب آیا، اس میں مسلمانوں کے علمی کاموں کا گہرا اثر تھا۔ اس دور میں جب یورپ نے اپنے علمی جمود کو توڑا، اس کے پیچھے مسلمانوں کی سائنسی تحقیقات اور فلسفیانہ افکار کی اہمیت پوشیدہ تھی۔ جوزف شاخت نے اس بات کو بھی اجاگر کیا کہ اسلامی تہذیب نے نہ صرف علم و حکمت کے میدان میں جدیدیت کی بنیاد رکھی بلکہ ان علوم کو بھی یورپ تک پہنچایا جو اس وقت تک مغربی دنیا میں اجنبی تھے۔

انہوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں نے علم کو ایک حقیقت پسندانہ اور منطقی انداز میں سمجھا اور اس کی تحقیق میں جو حکمت عملی اپنائی، اس نے یورپ کے اہل علم کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ نئے علوم کو سمجھنے اور ان پر تحقیق کرنے میں اپنے طریقے میں تبدیلی لائیں۔ شاخت نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلامی دنیا کے فلسفیوں اور سائنسدانوں نے جن اصولوں پر تحقیق کی، وہ بعد میں یورپ میں سائنسی انقلاب کی بنیاد بنے۔

یہ سچ ہے کہ اسلام نے سائنسی تحقیق کے لیے جو فکری بنیاد رکھی، وہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک نیا فکری دریچہ ثابت ہوئی۔ جوزف شاخت کے مطابق، مغرب کی نشاۃِ ثانیہ میں جو جرات مندانہ سائنسی تحقیق کی ہوا چلی، اس میں اسلامی تہذیب کا بنیادی کردار تھا، جس نے نہ صرف سائنسی ترقی کو آگے بڑھایا بلکہ مغربی دنیا کی علمی فضا کو بھی جدیدیت کی طرف گامزن کیا۔ جوزف شاخت (Joseph Schacht) لکھتا ہے:

> There is no doubt that the Islamic sciences exerted a great influence on the rise of European science; and in this Renaissance of knowledge in the west there was no single influence, but diverse ones; the main influence was of course, from Spain, then from Italy and Palestine

through the crusaders, who had mixed with Muslims and seen the effect of sciences in Muslim culture.[1]

''اِس اَمر میں قطعی کوئی شبہ نہیں کہ یورپ کے سائنسی فکر پر اِسلامی سائنسی فکر کا گہرا اَثر مرتب ہوا۔ مغرب کی اِس علمی نشاۃِ ثانیہ پر دِیگر کئی اَثرات بھی مرتب ہوئے۔ مگر بنیادی طور پر سب سے گہرا اَثر اندلس (Spain) سے آیا، پھر اٹلی اور فلسطین کی جانب سے اَثرات مرتب ہوئے کیونکہ صلیبی جنگوں نے مغربی ممالک کے لوگوں کو فلسطینی مسلم ثقافت اور سائنسی اُسلوب سے رُوشناس کرایا۔''

وِل ڈیورانٹ(Will Durant) ، جو کہ ایک معروف مغربی تاریخ دان اور فلسفی ہیں، نے مسلم تہذیب و ثقافت کے مغرب میں منتقلی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کا اثر مختلف اہم واقعات کے ذریعے واضح کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس بات کو تسلیم کیا کہ مسلمانوں کی علمی، سائنسی اور ثقافتی وراثت نے مغربی دنیا کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ مغرب کے فکری ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ڈیورانٹ نے مختلف تاریخی حوالوں اور واقعات کے ذریعے بتایا کہ کس طرح مسلمانوں نے علم و حکمت کے میدان میں جو انقلاب برپا کیا، اس نے مغرب کے ذہنی اور سائنسی ماحول کو جدیدیت کی طرف گامزن کیا۔ انہوں نے خاص طور پر اس بات کو اجاگر کیا کہ اسلامی دنیا میں سائنس، طب، فلسفہ، اور ریاضی کے شعبوں میں جو ترقی ہوئی، اس نے نہ صرف مسلمان معاشروں کی فلاح میں اہم کردار ادا کیا بلکہ ان علوم کا مغربی دنیا پر بھی دیرپا اثر رہا۔

ڈیورانٹ نے مثال کے طور پر اس دور کا ذکر کیا جب مسلمان سائنسدانوں اور فلسفیوں نے یونانی اور رومی علمی ورثے کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ ان پر مزید تحقیق کی اور ان کو اپنے جدید تصورات سے ہم آہنگ کیا۔ مسلمانوں نے ان علوم کو عربی زبان میں ترجمہ کر کے مغرب تک پہنچایا، جس کے نتیجے میں یورپ میں علمی اور فکری نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوا۔

انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ مسلمانوں نے نہ صرف اپنی ثقافت کو دیگر قوموں تک منتقل کیا، بلکہ ان کی اخلاقی اقدار اور معاشرتی نظریات بھی مغربی دنیا میں گہرے

[1] Joseph Schacht & C.E.Bosworth, *The Legacy of Islam*, pp .426-427.

اثرات مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ڈیورانٹ کے مطابق، مسلمانوں نے اپنی تہذیب و ثقافت کے ذریعے مغرب کو نئے خیالات، علمی اصول، اور سائنسی طریقہ کار کی روشنی عطا کی، جس کا اثر بعد ازاں مغربی سائنس، فلسفہ، اور ادب پر نمایاں طور پر دیکھا گیا۔

اس طرح، وِل ڈیورانٹ نے یہ تسلیم کیا کہ مسلم تہذیب کی مغرب میں منتقلی ایک پیچیدہ مگر انتہائی اہم عمل تھا جس نے مغرب کو نئے علمی اور ثقافتی افق تک پہنچایا۔ ان کے مطابق، مسلمانوں کا علم و فہم اور ان کی ثقافت نے مغربی دنیا کی ترقی میں ایک بنیاد فراہم کی جو آج تک جاری ہے۔ وِل ڈیورانٹ (Will Durant) نے مسلم تہذیب و ثقافت کے مغرب میں منتقلی کی تصریح کئی واقعات سے کی:

> The first paper-manufacturing plant in Islam was opened at Baghdad in 794 by Al-Fadl, son of Harun's Vezier. The craft was brought by the Arabs to Sicily and Spain, and there passed into Italy and France.[1]

''اسلام کا پہلا کاغذ سازی کا پلانٹ ۷۹۴ء میں بغداد میں ہارون کے وزیر کے بیٹے الفضل نے لگایا۔ عرب یہ فن یہاں سے سسلی اور سپین لائے۔ اور یہاں سے یہ فن اٹلی اور فرانس منتقل ہوا۔''

جارج سارٹن(George Sarton) ، جو معروف تاریخ دان اور سائنسی تاریخ کے ماہر ہیں، نے اس بات کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ قرون وسطی کے مغربی علوم و فنون کو اسلامی علوم سے علیحدہ کر کے اور صرف لاطینی سائنس کی کتابوں سے جوڑ کر پیش کرنا، دراصل تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ نقطہ نظر تاریخ کی سچائی کو نظر انداز کرتا ہے اور ایک اہم حقیقت کو چھپاتا ہے کہ مغرب میں سائنسی ترقی اور علمی نشوو نما میں مسلمانوں کا کلیدی کردار تھا۔

سارٹن نے اس بات کو سراہا کہ مغربی سائنس کی بنیاد صرف لاطینی زبان میں موجود کتب پر نہیں رکھی گئی، بلکہ مسلمانوں کی علمی میراث نے مغرب کی علمی فضا کو گہرے اثرات دیے۔ مسلمانوں نے یونانی، رومی، ایرانی اور ہندوستانی علوم کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ ان پر

---

1 Will Durant, *The Age of Faith*, p. 236.

مزید تحقیق کی اور انہیں نئی جہتوں سے ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے مختلف سائنسی، فلسفیانہ اور طبی موضوعات پر تحقیقات کیں، جنہیں بعد ازاں مغربی سائنسدانوں نے قبول کیا اور ان سے استفادہ کیا۔

جارج سارٹن نے اس بات کو بھی اجاگر کیا کہ اسلامی دنیا کے علماء نے جن اصولوں اور طریقوں کو اپنایا، وہ مغربی سائنسی انقلاب کی بنیاد بنے۔ مسلمانوں نے نہ صرف علمی مواد کو ترجمہ کیا بلکہ ان علوم کی گہرائی میں جا کر ان میں مزید اضافے کیے، جس نے مغرب کو نئے سائنسی اور فکری افق سے روشناس کرایا۔ اس طرح، سارٹن کے مطابق، اسلامی علوم کی نظر اندازی اور انہیں صرف لاطینی کتب کے ساتھ محدود کرنا ایک بڑی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش ہے۔

سارٹن نے اس تاثر کو غلط قرار دیا کہ مغربی علوم کا آغاز صرف لاطینی زبان میں موجود تحریروں سے ہوا۔ ان کے مطابق، یہ حقیقت کہ مسلمان علماء نے نہ صرف علوم کو ترجمہ کیا بلکہ ان میں اضافے اور اصلاحات کیں، اس بات کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ مغرب کی سائنسی ترقی میں مسلمانوں کی شراکت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے مطابق، اسلامی دنیا کے سائنسی اور فکری کام نے مغرب کو جو فکری مواد فراہم کیا، وہ نہ صرف یورپ میں سائنسی انقلاب کا باعث بنا بلکہ ایک عالمی علمی اور ثقافتی تبادلے کی بنیاد رکھی جس سے تمام انسانیت فائدہ مند ہوئی۔ الغرض جارج سارٹن (George Sarton) کے مطابق قرون وسطی کے مغربی علوم و فنون کو اسلامی علوم سے الگ کر کے صرف لاطینی سائنس کی کتابوں سے جوڑ کر بیان کرنے کی کوشش تاریخ کو مسخ کرنے علاوہ کچھ نہیں:

> This illustrates the absurdity of trying to appraise mediaeval thought on the basis of Latin writings alone. For centuries the Latin scientific books hardly counted; they were out-of-date and outlandish. Arabic was the international language of science to a degree which had never been equalled by another language before (except Greek) and has never been repeated since. It was the

language not of one people, one nation, one faith, but of many peoples, many nations, many faiths.[1]

''اس سے قرون وسطی کے مغربی علوم و فنون کو اسلامی علوم سے الگ کر کے صرف لاطینی سائنس کی کتابوں سے جوڑ کر بیان کرنے کی لغویت کا اظہار ہوتا ہے۔ صدیوں تک تو یہاں لاطینی سائنسی کتابوں کی بمشکل ہی کوئی اہمیت تھی۔ وہ پرانی (بے وقعت) اور بے نام تھیں۔ جبکہ عربی سائنسی علوم کے اظہار کی اعلی درجے کی حامل ایسی زبان تھی کہ نہ اس سے قبل (سوائے یونانی کے) کوئی زبان اس کے ہم پلہ نہ ہو سکی اور نہ ہی بعد میں۔ یہ صرف چند لوگوں، ایک قوم یا ایک عقیدہ کی زبان نہ تھی بلکہ یہ کئی لوگوں، کئی قوموں اور کئی عقیدوں کی زبان تھی۔''

The best Arabic scientists were not satisfied with the Greek and Hindu science which they inherited. They admired and respected the treasures which had fallen into their hands, but they were just as "modern" and greedy as we are, and wanted more. They criticized Euclid, Apollonios and Archimedes, discussed Ptolemy, tried to improve the astronomical tables and to get rid of the causes of error lurking in the accepted theories. They facilitated the evolution of algebra and trigonometry and prepared the way for the European algebraists of the sixteenth century.[2]

''بہترین عرب سائنسدان اس یونانی اور ہندی علم سے مطمئن نہ تھے جو انہیں ورثہ میں ملا۔ انہوں نے اس علمی خزانے کی تعریف اور توقیر کی مگر وہ اس پر انحصار کرنے میں ہماری طرح جدید اور حریص تھے کہ اس میں مزید اضافہ کریں۔ انہوں نے اقلیدس، اپولونئس اور ارشمیدس پر تنقید کی اور بطلیموس پر بھی بحث کی، فلکیاتی جداول کو ترقی دی اور مقبول

---

1 George Sarton, *A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition*, p. 28.

2 George Sarton, *A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition*, p. 28.

نظریات میں اغلاط اور تسامحات دور کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے الجبرا اور تکونیات کو ترقی دی۔ اور یورپ کی سولہویں صدی کے ماہرین الجبرا کے لئے راہیں ہموار کیں۔''

مسلمان سائنسدانوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں ہی بڑے بڑے ہسپتال اور طبی ادارے قائم کر لئے تھے، جہاں علمِ ادویہ (pharmacy) اور علمِ جراحت (surgery) کی کلاسیں باقاعدہ طور پر چلتی تھیں۔[1] یہ ادارے نہ صرف مسلمانوں کی طبی مہارت کی عکاسی کرتے تھے بلکہ دنیا بھر میں علمی و سائنسی ترقی کے ایک مرکز کی حیثیت رکھتے تھے۔

تقریباً گیارہ سو سال پہلے، عالمِ اسلام کے عظیم طبیب الرازی (930ء) نے علمِ طب پر ۲۰۰ سے زائد کتب تصنیف کیں، جن میں سے بعض کا ترجمہ لاطینی، انگریزی اور دیگر جدید زبانوں میں کیا گیا اور ۱۴۹۸ء سے ۱۸۶۶ء تک ان کتابوں کو تقریباً ۴۰ مرتبہ شائع کیا گیا۔ الرازی نے سب سے پہلے Smallpox اور Measles کی صحیح تشخیص کی اور ان بیماریوں کی علامات کو واضح کیا۔ انہوں نے یونانی طب کے کئی اصولوں کو سائنسی بنیادوں پر پرکھا اور ان میں سے کئی کو رد کیا، جس سے طب کے شعبے میں ایک نیا آغاز ہوا۔

اسی طرح، ابو علی الحسین بن سینا (Avicenna) نے اپنی مشہور تصنیف القانون (Canon of Medicine) کے ذریعے طب کی دنیا میں ایک عظیم باب کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کا ترجمہ عربی سے لاطینی اور دیگر زبانوں میں کیا گیا اور یہ ۱۶۵۰ء تک یورپ کی بیشتر یونیورسٹیوں میں نصاب کا حصہ رہی۔ Watt M. Watt کے مطابق، ''یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابن سینا کی قانون پوری تاریخِ انسانیت میں سب سے زیادہ مطالعہ میں رہنے والی طبی تصنیف ہے۔''[2] اس کتاب نے مغرب کے طبی علوم کو نئی جہت دی اور یورپ میں طب کی تدریس میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔

پانچویں صدی ہجری کے مسلمان سائنسدان عبد الملک ابن زہر نے سینے، قلب، غذا کی نالی اور معدے کے السر سمیت کئی ایسے امراض کی تشخیص اور علاج بیان کیا جو اُس وقت کے

---

1 Nasr, Seyyed Hossein, *Islamic Science: An Illustrated Study*, Kazi Publishers Incorporated, Lahore, 1995, p. 156.

2 Watt M. Watt, *The Influence of Islam on Medieval Europe*, pp. 38, 67.

طب کے لیے نہایت اہمیت رکھتے تھے۔ ان کی تحقیقات نے طب کے شعبے میں مزید ترقی کی راہ ہموار کی۔ مسلمانوں نے علمِ اسبابِ امراض (Pathology) میں بھی کمال حاصل کیا۔ ابن الخطیب نے اپنی کتاب مقنعة السائل عن المرض الهائل [1] میں چھوت کی بیماریوں کے لیے نئے اصول اور علاج بیان کیے، جو بعد میں مغربی طب میں شامل ہوئے۔ M. Muller نے ۱۸۶۳ء میں ابن الخطیب کی مذکورہ کتاب کا ترجمہ کیا، جس سے یورپ میں اس موضوع پر نئی معلومات فراہم ہوئیں۔ [2]

ابو ریحان البیرونی (1048ء) نے علمِ ادویہ (pharmacology) کو ایک منظم طریقے سے مرتب کیا اور اس شعبے میں کئی نئی دریافتیں کیں۔ ان کی تحقیق نے جدید دوا سازی کے اصولوں کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح، علی بن عیسیٰ بغدادی اور عمار الموصلی نے امراضِ چشم اور آنکھ کی ساخت (ophthalmology) پر اپنی تصانیف پیش کیں، جو اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف اوّل تک فرانس اور یورپ کی طبی درسگاہوں (medical colleges) میں بطور نصابی کتب (textbooks) شامل نصاب تھیں۔ [3]

یہ تمام علمی کارنامے مسلمانوں کی طب کے شعبے میں اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں اور ان کے سائنسی ذخائر کی اہمیت کو ثابت کرتے ہیں۔ ان کی تحقیقات نے نہ صرف اسلامی دنیا کو فائدہ پہنچایا بلکہ مغربی دنیا بھی ان کے علمی سرمایہ سے استفادہ کرتے ہوئے طبی میدان میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ مسلمانوں کی یہ سائنسی وراثت آج بھی عالمی طب کے معیار کا ایک قیمتی حصہ ہے۔

---

1 Muller, M., Sitzungsberichte der koniglich - bayerischen Akademie der Wissenschaften, Munchen, 2/1863/1-34.

2 Retso, Jan, *The Arabs in Antiquity*, Routledge Curzon, London, 2003, p.107; Salehah Yaacob, "The Dilemma of the Translation Conceptin Islamic Sources", *Global Journal of Human Social Science: G Linguistics & Education*, Volume 19, Issue 6,Version 1.0, Year, 2019, ISSN(e): 2249-460x & ISSN (p): 0975-587X, p.48.

3 Manfred Ullmann, *Islamic Medicine*, pp. 12, 103-4., Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, p. 629

ایک غیر مسلم مغربی مفکر ای جی براؤن (E. G. Browne) نے اپنے تجزیے میں ایک دلچسپ حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ جب عیسائی یورپ کے لوگ اپنی بیماریوں کا علاج کرنے کے لئے بتوں کے سامنے جھکتے اور توہمات پر یقین رکھتے تھے، اس وقت مسلمانوں کے ہاں لائسنس یافتہ ڈاکٹرز، ماہرین، اور باقاعدہ شاندار ہسپتال موجود تھے۔ براؤن نے اس بات کو بہت اہمیت دی کہ اسلامی دنیا میں طب کے میدان میں نہ صرف سائنسی بنیادوں پر تحقیق کی جاتی تھی، بلکہ یہاں کے طبی ادارے انتہائی ترقی یافتہ اور جدید تھے۔ مسلمانوں نے طب کو محض ایک پیشہ نہیں سمجھا بلکہ اسے علم و حکمت کا ایک حصہ بنایا، جس کا مقصد انسانی زندگی کے معیار کو بلند کرنا اور بیماریوں کا علاج سائنس کے اصولوں پر کرنا تھا۔

براؤن مزید لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی طبی تعلیم و تربیت کو بہت منظم کیا تھا۔ اس وقت کے اسلامی ہسپتال نہ صرف علاج معالجہ فراہم کرتے تھے، بلکہ یہاں تحقیق کی جاتی تھی اور مریضوں کا بہترین علاج کرنے کے لئے جدید طریقے اپنائے جاتے تھے۔ ان ہسپتالوں میں صرف علاج کی سہولتیں نہیں تھیں بلکہ یہاں طبی تعلیم اور تربیت کے ادارے بھی تھے جہاں نئی نسل کو جدید سائنسی طریقوں سے آشنا کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں کے یہ طبی ادارے یورپ میں موجود سادہ اور ابتدائی طبی خدمات سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور موثر تھے۔ یہاں کے ڈاکٹروں نے بیماریوں کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی اور جدید طبی سائنسی اصول وضع کیے، جو بعد میں یورپ میں سائنسی انقلاب کی بنیاد بنے۔ براؤن کے مطابق، جب یورپ میں طب کا علم ابتدائی طور پر مذہبی عقائد اور توہمات کی بنیاد پر تھا، مسلمانوں نے اس کو ایک علمی، سائنسی اور تجرباتی میدان میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کی کوششوں سے انسانیت کو نہ صرف بہتر علاج کی سہولت ملی بلکہ طب کی حقیقت پسندانہ اور سائنسی بنیاد بھی مستحکم ہوئی۔ براؤن کے یہ الفاظ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی دنیا نے سائنسی میدان میں جو نمایاں ترقی کی، وہ یورپ کی ابتدائی سائنسی جمود کو ختم کرنے اور جدید علوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے والی تھی:

> The practice of medicine was regulated in the Muslim world from the tenth century onwards. At one time, Sinan ibn Thabit was Chairman of the Board of

Examiners in Baghdad. Pharmacists were also regulated and the Arabs produced the first pharamcopia drug stores. Barber shops were also subject to inspection. Travelling hospitals were known in the eleventh century.... The great hospital of al-Mansur, founded at Damascus around 1284 AD, was open to all sick persons, rich or poor, male or female, and had separate wards for men and women. One ward was set apart for fevers, another for ophthalmic cases, one for surgical cases and one for dysentry and kindred intestinal ailments. There were in addition, kitchens, lecture-rooms, a dispensary and so on.[1]

''اِسلامی دُنیا میں دسویں صدی عیسوی سے ہی علمِ طب اور ادویہ سازی کو منظم اور مرتب کر دیا گیا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا جب سنان بن ثابت بغداد میں ممتحنین کے بورڈ کے صدر تھے۔ ادویہ سازوں کو بھی باقاعدہ منظم کیا گیا تھا اور عربوں نے ہی سب سے پہلے میڈیکل سٹورز قائم کئے حتیٰ کہ طبی نقطہ نظر سے حجاموں کی دُکانوں کا بھی معائنہ کیا جاتا تھا۔ گیارہویں صدی میں سفری (mobile) ہسپتالوں کا بھی ذِکر ملتا ہے۔ ۱۲۴۸ء کے قریب دِمشق میں قائم شدہ عظیمُ الشان 'المنصور ہسپتال' موجود تھا۔ جس کے دروازے امیر و غریب، مرد و زن، غرض تمام مریضوں کے لئے کھلے تھے اور اُس ہسپتال میں عورتوں اور مردوں کے لئے علیحدہ علیحدہ وارڈ موجود تھے۔ ایک وارڈ مکمل طور پر بخار کے لئے (fever ward) ایک آنکھوں کی بیماریوں کے لئے (eye ward) ایک وارڈ سرجری کے لئے (surgical ward) اور ایک وارڈ پیچش (dysentry) اور آنتوں کی بیماریوں (intestinal ailments) کے لئے مخصوص تھا۔ علاوہ ازیں اُس ہسپتال میں باورچی خانے، لیکچر ہال اور اَدویات مہیا کرنے کی ڈسپنسریاں بھی تھیں اور اِسی طرح طب کی تقریباً ہر شاخ کے لئے یہاں اِہتمام کیا گیا تھا۔''

یہ بات طے شدہ ہے کہ مسلمانوں کی طبی تحقیقات و تعلیمات کے تراجم یورپی زبانوں میں کئے گئے جن کے ذریعے یہ سائنسی علوم یورپی مغربی دُنیا تک منتقل ہوئے۔

---

1 Edward Granville Browne, *Arabian Medicine*, p. 101.

خاص طور پر ابو القاسم زہراوی اور المجوسی کی کتب نے طبی تحقیق کی دُنیا میں اِنقلاب بپا کیا۔ ملاحظہ ہو:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی طبی تحقیقات اور تعلیمات کے تراجم یورپی زبانوں میں کیے گئے، جن کے ذریعے یہ سائنسی علوم مغربی یورپ تک منتقل ہوئے اور اس نے یورپ کی طبی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلمانوں نے نہ صرف طب کے شعبے میں انقلابی کام کیا بلکہ انہوں نے اپنے علم کو مختلف طریقوں سے دستاویزی صورت میں محفوظ کیا، جس کی بنیاد پر یورپی سائنسدانوں اور ڈاکٹروں نے اپنے کام کو آگے بڑھایا۔ ان تراجم کے ذریعے مغرب کو وہ علمی ورثہ ملا جو مسلمانوں نے اپنے دور میں حاصل کیا تھا، اور جس کی بدولت یورپ نے طب، جراحی، اور دیگر سائنسی علوم میں ترقی کی۔

خاص طور پر دو اہم مسلم شخصیات، ابو القاسم زہراوی اور علی بن عباس مجوسی کی کتب نے طبی تحقیق کی دنیا میں زبردست انقلاب برپا کیا۔ ابو القاسم زہراوی کی کتاب التصریف لمن عجز عن التألیف نے جراحی کے فن میں انقلابی اقدامات کی طرف رہنمائی کی۔ ان کی تحریریں نہ صرف اس وقت کی جدید جراحی کی تکنیکوں پر روشنی ڈالتی ہیں بلکہ انہوں نے کئی ایسے آپریشنز کی تفصیلات فراہم کیں جو آج تک استعمال ہو رہے ہیں۔ زہراوی کا کام جراحی کی بنیاد رکھنے میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور مغربی دنیا نے ان کے کام سے بے شمار فائدہ اٹھایا۔ ان کی کتاب کے تراجم یورپ میں ہوئے، اور اس کے اثرات نے یورپ کی جراحی کی تکنیکوں کو نئی سمت دی۔

اسی طرح علی بن عباس مجوسی کی کتاب کتاب الملکی نے طب کے شعبے میں شاندار پیش رفت کی اور اس نے طب کی تشخیص، علاج اور مختلف بیماریوں کے انتظام میں نئی راہیں دکھائیں۔ مجوسی کی تحریروں نے یورپ میں طب کے تعلیم دینے کے طریقوں میں تبدیلی لانے کے علاوہ جدید سائنسی طریقوں کو مستحکم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کتاب نے مغرب کے طبی ماہرین کو وہ علم فراہم کیا جس سے انہوں نے اپنے طریقہ علاج اور تشخیصی عمل کو بہتر بنایا۔

یہ حقیقت کہ مسلمانوں کی علمی تحقیقات کا مغربی دنیا میں ترجمہ ہوا اور اسے اپنایا گیا، نہ صرف یہ کہ اسلامی تہذیب کی سائنسی کامیابیوں کا غماز ہے بلکہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مسلمانوں نے علم و حکمت کی روشنی کو دنیا بھر میں پھیلایا۔ ان کی کتب اور تحقیقی کام نہ صرف مسلمانوں کے لئے باعث فخر ہیں بلکہ یہ ساری انسانیت کے لئے علم کا ایک خزانہ ہیں جس نے دنیا کو نئے سائنسی افق پر پہنچایا۔

> Their medical studies, later translated into Latin and the European languages, revealed their advanced knowledge of blood circulation in the human body. The work of Abu`l-Qasim al-Zahrawi, Kitab al-Tasrif,on surgery, was translated into Latin by Gerard of Cremona and into Hebrew about a century later by Shem-tob ben Isaac. Another important work in this field was the Kitab al-Maliki of al-Majusi (died 982 AD), which shows according to Browne that the Muslim physicians had an elementary conception of the capillary system (optic) and in the wokrs of Max Meyerhof, Ibn al-Nafis (died 1288 AD) was the first in time and rank of the precursors of William Harvery. In fact, he propounded the theory of pulmonary circulation three centuries before Michael Servetus. The blood, after having been refined must rise in the arterious veins to the lung in order to expand its volume, and to be mixed with air so that its finest part may be clarified and may reach the venous artery in which it is transmitted to the left cavity of the heart.[1]

"اُن کے طبی علم اور معلومات والی کتب جن کا بعد ازاں لاطینی اور یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا، اُن کی اِنسانی جسم میں خون کی گردِش کے متعلق وُسعتِ علم کا اِنکشاف کرتی ہیں۔ 'ابوالقاسم الزہراوی' کی جراحی پر تحقیق 'کتابُ التصریف لِمَن عجز عن التالیف' جس کا ترجمہ Gerard کے Cremona نے لاطینی زبان میں کیا، اور ایک صدی بعد Shem-tob ben Isaac نے عبرانی زبان میں کیا۔ اِسی میدان میں ایک اور اہم ترین کام المجوسی (وفات

[1] Meyerhof, M., "Ibn al-Nafis and his Theory of the Lasser Circulation," *Islamic Science*, 23: 166, June, 1935.

۹۸۲ء) کی تصنیف 'کتابُ الملکی' ہے، 'براؤن' کے مطابق یہ کتاب اِس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مسلمان اَطباء کو شریانوں کے نظام کے بارے میں بنیادِی تصوّرات اور معلومات حاصل تھیں اور 'میکس میئرہوف' کے اَلفاظ میں 'ابنُ النفیس' (وفات ۱۲۸۸ء) وقت اور مرتبے کے لحاظ سے 'ولیم ہاروے' کا پیش رَو تھا۔ حقیقت میں اُس نے 'مائیکل سرویٹس' سے تین صدیاں پہلے سینے میں پھیپھڑوں کی حرکت اور خون کی گردِش کا سراغ لگایا تھا۔ خون صاف کئے جانے کے بعد بڑی بڑی شریانوں میں وہ یقیناً پھیپھڑے کی شریانوں میں بلند ہونا چاہئے تاکہ اُس کا حجم بڑھ سکے اور وہ ہوا کے ساتھ مل سکے تاکہ اُس کا بہترین حصہ صاف ہو جائے اور وہ نبض کی شریان تک پہنچ سکے جس سے یہ دِل کے بائیں حصے میں پہنچتا ہے۔"

مغربی محققین جیسے جارج سارٹن (George Sarton) اور ہیری ایچ گلک (Harry H. Gulick) نے علم ادوِیہ سازی یعنی فارمیسی اور ادویات کی تیاری میں مسلمانوں کی خدمات اور کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ان محققین نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مسلمانوں نے نہ صرف طب کے میدان میں جدید سائنسی اصول وضع کیے بلکہ ادویات کی تیاری اور دواسازی کے علم کو بھی ایک منظم اور سائنسی بنیاد پر استوار کیا۔

جارج سارٹن نے اپنی تحقیق میں مسلمانوں کی علمی وراثت کو اہمیت دیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں نے نہ صرف یونانی اور رومی طب کو محفوظ کیا بلکہ اس میں جدید اضافے اور تحقیق کی بدولت اسے مزید ترقی دی۔ انہوں نے ادویہ سازی کے علم میں مسلمانوں کی کامیاب ترین تجربات کا تذکرہ کیا، خاص طور پر ان کے طریقہ کار اور علم کی بنیاد پر کی گئی نئی دریافتوں کا ذکر کیا جو مغرب میں طب کی بنیاد بنیں۔

اسی طرح ہیری ایچ گلک نے بھی مسلمانوں کی ادویہ سازی کی مہارتوں کا اعتراف کیا اور ان کے طریقوں کو سراہا۔ انہوں نے لکھا کہ مسلمانوں نے نہ صرف دوا سازی میں تجربات کیے بلکہ دوا کی تیاری کے مختلف طریقے وضع کیے جنہیں بعد میں یورپ میں اپنایا گیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق مسلمانوں نے دوا سازی کے حوالے سے کئی جدید فارمولے اور طریقے دریافت کیے، جن میں مختلف جڑی بوٹیوں کی خصوصیات اور ان کے طبی اثرات کی تفصیل شامل تھی، اور ان کا استعمال آج بھی دنیا بھر میں جاری ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں نے ادویہ سازی کے علم کو محض ایک پیشہ نہیں سمجھا بلکہ اسے ایک سائنسی اور تحقیق پر مبنی عمل بنایا۔ ان کی دریافتوں اور تجربات نے نہ صرف مسلمانوں کی طبی دنیا کو آگے بڑھایا بلکہ یہ علم یورپ میں منتقل ہونے کے بعد مغربی طب اور فارمیسی کی ترقی کا سبب بھی بنا۔ ان محققین کے مطابق، مسلمانوں کی ادویہ سازی میں کی جانے والی تحقیق اور ان کے طریقہ کار نے اس شعبے کو ایک نیا رخ دیا، جو آج بھی سائنسی دنیا میں اہمیت رکھتا ہے۔

اس طرح، جارج سارٹن اور ہیری ایچ گلک جیسے مغربی محققین نے مسلمانوں کی ادویہ سازی کے میدان میں کی جانے والی عظیم خدمات کو تسلیم کیا ہے، اور ان کے کام کو دنیا بھر کے سائنسی ورثے میں شامل کیا ہے۔ ان محققین کا اعتراف اس بات کا غماز ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف علم و حکمت کی بنیاد رکھی بلکہ دنیا بھر میں اس علم کو پھیلایا اور اسے سائنسی تحقیق کی جدید دنیا کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ حسین نصر لکھتے ہیں:

> Ibn al-Baytr wrote the Collection of Simple Drugs, which is regarded as the greatest Arabic book on botany of the age. He collected plants, herbs and drugs around the Mediterranean from Spain to Syria and described more than 1400 medicinal drugs, comparing them with the records of over 150 writers before him.[1]

"ابن بیطار نے سادہ ادویات کے مجموعے (collection of simple drugs) کے نام سے ایک کتاب لکھی جو کہ علمِ نباتات (botany) پر عربی زبان میں اُس زمانے کی سب سے بڑی تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔ اُس نے بحیرہ رُوم میں اندلس(Spain) سے لے کر شام(Syria) تک کے علاقے سے مختلف پودے، جڑی بوٹیاں اور دوائیاں اِکٹھی کیں اور ۱۴۰۰ سے بھی زیادہ طبی ادویات کا اپنی کتاب میں ذِکر کیا اور اُن کا موازنہ اپنے سے قبل ۱۵۰ دِیگر مصنّفین کی تصنیفات سے بھی کیا۔"

اُس دَور کے عظیم مسلمان ادوِیہ سازوں(pharmacologists) میں ابو بکر محمد بن زکریا رازی، علی بن عباس، ابوالقاسم خلاف ابن عباس الزہراوی (جسے لاطینی زبان میں

---

[1] Syed Husain Nasr, *Islamic Science*, p.181.

Albucasis کا نام دیا گیا)، ابو مروان ابن زہر (جسے لاطینی زبان میں Avenzoar کا نام دیا گیا) کے نام بڑے معروف ہیں۔ اِسی طرح طب (medicine) پر ابنِ رُشد (Averoes) کی 'کتابُ الکلیات' ایک معرکہ آراء تصنیف ہے، جسے لاطینی میں ترجمہ کر کے پورے عالمِ مغرب میں نصابی کتاب (text book) کا درجہ دیا گیا مگر افسوس کہ ترجمہ کے ذریعے اُس کا نام بدل کر colliget بن گیا۔[1] 'کتاب الکلیات' میں امراض چشم پر وسیع مباحث ہیں جن میں آنکھ کے امراض اور ان کا علاج بیان کیا گیا ہے۔[2] 'کتاب الکلیات' میں امراض نسواں پر بھی مباحث موجود ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ یورپ میں شامل نصاب رہنے والی مسلمان سائنسدانوں کی تصانیف میں ابن سینا کی قانون (Canon of Medicine) رازی کی (The Comprehensive Book, or Liber Continens) بھی شامل ہیں۔[3]

علم جراحت (سرجری) کے میدان میں مسلمانوں کی غیر معمولی تحقیقات اور جدید انکشافات نے دنیا بھر میں سائنسی اور طبی ترقی کو ایک نیا رخ دیا۔ مسلمانوں نے نہ صرف جراحی کے بنیادی اصول وضع کیے بلکہ اس میں نئی تکنیکیں اور طریقے بھی دریافت کیے، جنہوں نے علاج اور سرجری کے شعبے میں انقلاب برپا کیا۔ اس حوالے سے اندلس کے عظیم طبیب اور سرجن ابو القاسم بن عباس الزہراوی کا نام انتہائی اہمیت رکھتا ہے، جن کی جراحی کی تحقیق اور جدید طریقوں نے اس علم کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔

پروفیسر فلپ کے ہٹی (Philip K. Hitti) نے ابو القاسم الزہراوی کی سرجری میں کی جانے والی تحقیق اور ان کے انکشافات کی اہمیت کو سراہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ الزہراوی کی کتاب التصریف لمن عجز عن التألیف نے جراحت کے علم کو ایک منظم، سائنسی اور تجرباتی طریقے سے ڈھالا۔ الزہراوی نہ صرف جراحی کے بنیادی اصولوں کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہیں بلکہ انہوں نے عملی طور پر سرجری کے مختلف طریقوں کو بھی

---

1 Edward Grant, The Foundations of Modern Science in the Middle Ages: Their Religious, Institutional and Intellectual Context, p. 49.

2 Michael J. O'Dowd, The History of Medication for Women, p. 113.

3 Prudence Allen, The Concept of Woman: The Aristotelian Revolution, p. 521.

بیان کیا جنہیں آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ہٹی نے الزہراوی کی جراحی کی تکنیکوں کو یورپ کے طبی میدان میں اہم سنگ میل قرار دیا، اور ان کی کتاب کو جراحی کے علم میں ایک انقلاب کے طور پر تسلیم کیا۔

الزہراوی کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے سرجری کے عمل کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا۔ ان کے طریقے صرف تجربات پر مبنی نہیں تھے بلکہ ان میں طبی اخلاقیات، حفظان صحت اور مریض کی دیکھ بھال کی بھی بھرپور تفصیل تھی۔ انہوں نے جراحی کے کئی پیچیدہ آپریشنز کی تفصیل سے وضاحت کی اور نئے آلات کی ایجاد کی جو جراحی کے عمل کو زیادہ مؤثر اور محفوظ بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔

پروفیسر ہٹی نے الزہراوی کے جراحی کے طریقوں کو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ دنیا بھر کے طبی ماہرین کے لیے ایک قیمتی ورثہ قرار دیا۔ ان کے مطابق، الزہراوی کی تحقیق نے یورپ کے جراحوں کو نئی تکنیکوں اور طریقوں کا تعارف کرایا، اور ان کے کام کا اثر مغربی طب میں نظر آنا شروع ہوا، خاص طور پر جب مسلمانوں کی کتابیں لاطینی میں ترجمہ ہو کر یورپ پہنچیں۔ ان کتابوں میں الزہراوی کی جراحی کی تکنیکوں کا ذکر تھا، جنہیں مغربی دنیا نے اپنے سائنسی اور طبی کاموں میں شامل کیا۔

اس طرح، ابوالقاسم الزہراوی کی جراحی میں کی جانے والی تحقیق اور ان کے انکشافات نے نہ صرف اسلامی دنیا کو بلکہ پوری انسانیت کو فائدہ پہنچایا، اور ان کا اثر آج تک جراحی کے علم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر فلپ کے ہٹی جیسے محققین نے ان کے کام کو سراہا اور اسے ایک تاریخی سنگ میل قرار دیا، جو طب اور جراحت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

پروفیسر ہٹی (Philip K. Hitti) لکھتا ہے:

> Albucasis (1013 AD) was not only a physician but a surgeon of the first rank. He performed the most difficult surgical operations in his own and the obstetrical departments. The ample description he has left of the surgical instruments employed his time gives an idea of the development of surgery among the Arabs in lithotomy, he was equal to the foremost surgeons of

modern times. His work al-Tasrif li-Man Ajaz an al-Ta'alif (an aid to him who is not equal to the large treatises) introduces or emphasises new ideas. It was translated into Latin by Gerard of Cremona and various editions were published at Venice in 1497 AD, at Basle in 1541 AD and at Oxford in 1778 AD. It held its own for centuries as the manual of surgery in Salerono, Montpellier and other early schools of medicine.[1]

"آپ نہ صرف ایک ماہر طبیب تھے بلکہ اوّل درجے کے عظیم سرجن بھی تھے۔ اُنہوں نے اپنے شعبے میں اِنتہائی مشکل اور پیچیدہ سرجری (آپریشن) کئے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے زچگی کے شعبے میں بھی آپریشن کئے اور اُنہوں نے اپنے زیر استعمال آلاتِ سرجری کی بڑی واضح اور روشن وضاحت کی ہے، جس سے عربوں میں سرجری کے فن کی ترقی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ Lithotomy میں وہ موجودہ دَور کے عظیم ترین سرجنوں کا ہم پلہ تھے۔ اُن کا کام 'التصریف لِمن عجز عنِ التالیف' نئے تصورات کو متعارف کرواتا ہے۔ اُس کا ترجمہ کریمونا (Cremona) کے Gerard نے کیا اور اُس کے مختلف ایڈیشن ۱۴۹۷ء میں وِینس سے اور ۱۵۴۱ء میں باسلے اور ۱۷۷۸ء میں آکسفورڈ سے شائع ہوئے۔ اُنہوں نے اپنا مقام و مرتبہ صدیوں تک سرجری کے علم میں برقرار رکھا اور طب کے اِبتدائی اَیام میں بھی طبی سکولوں میں اچھے کام کے ساتھ متعارف رہے۔"

سید حسین نصر نے ابنِ زہر کے علمی مقام و مرتبہ کے بارے میں تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابنِ زہر کو جالینوس کے بعد سب سے بڑا طبیب تسلیم کیا جاتا ہے، اور اس کا یہ عظیم مقام اس کی " ادویہ سازی" (فارمیسی) کے میدان میں کیے گئے شاندار کام اور "خوراک اور غذائیت کی نشو و نما" پر کی جانے والی گہری تحقیق کی وجہ سے ہے۔ ابنِ زہر نے اپنی زندگی میں طب کے مختلف شعبوں میں نہ صرف اہم دریافتیں کیں، بلکہ وہ اس وقت کے طبی اصولوں کو جدید سائنسی طریقوں سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ابنِ زہر کی تحقیقات میں خصوصاً ادویہ سازی اور دواؤں کی تیاری کے علم پر ان کی گہری نظر اور تجربات نے اس شعبے کو نئے اصولوں پر استوار کیا۔ اس کے علاوہ، اس نے خوراک

---

1 Philip K. Hitti, History of Arabs, pp. 576-577.

اور غذائیت کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا، جو بعد میں جدید طب کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ سید حسین نصر کے مطابق، ابنِ زہر کی یہ تحقیق اور اس کے تحقیقی کام نے اس وقت کی سائنسی اور طبی دنیا میں ایک انقلابی تبدیلی لائی، جس کی بدولت اس نے جالینوس کے بعد طب کے شعبے میں اپنی بے مثل اہمیت ثابت کی۔

ابنِ زہر کی کتب نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ یورپ کے طبی ماہرین کو بھی متاثر کیا۔ ان کی علمی خدمات اور جدید طریقوں نے نہ صرف علاج کے اصولوں کو بدل دیا بلکہ دواؤں کی تیاری اور غذائیت کے شعبے میں بھی نئے اصول قائم کیے۔ سید حسین نصر کی رائے میں، ابنِ زہر کا کام اس بات کا غماز ہے کہ وہ نہ صرف اپنے دور کا ایک عظیم طبیب تھا بلکہ اس کا علم اور تحقیق آج تک طب کے میدان میں اہمیت رکھتی ہے:

> Al-Zahrawi's rank in the art of surgery was paralleled by that of Ibn Zuhr (Aven-Zoar) in the science of medicine (1091-1162 AD). Of the six medical works written by them three are extent. The most valuable is al-Taysir fil-Mudawat al-Tadbir (the Facilitation of Therapy and Diet). Ibn Zuhr is hailed as the greatest physician since Galen. At least he was the greatest clinician in Islam after al-Razi. Ibn Zuhr wrote another book, Kitab al-Aghdhiyah (the Book of Diets) which is among the best of its kind dealing with the subject.[1]

"ابنِ زہر کا مرتبہ ادویہ (medicine) میں وُہی ہے جو الزہراوی کا سرجری (surgery) کے فن میں تھا۔ جو چھ قسم کا کام اُنہوں نے 'ادویہ سازی' پر کیا اُن میں سے تین ابھی تک جاری و ساری ہیں۔ سب سے گراں قدر کام 'خوراک اور غذائیت کی نشو و نما' ہے۔ جالینوس کے بعد ابنِ زہر کو سب سے بڑا طبیب تسلیم کیا جاتا ہے۔ کم از کم 'الرازی' کے بعد دُنیائے اِسلام میں وہ سب سے بڑے مطب (clinic) کے مالک تھے۔ ابنِ زہر نے ایک اور تصنیف 'کتاب الاغذیہ' بھی لکھی، جو اپنے موضوع کے اِعتبار سے اہم ترین کتب میں شمار ہوتی ہے"۔

---

1 Syed Husain Nasr, Islamic Science, p. 181.

مسلم سائنسدانوں اور اطباء نے طب کی مختلف شاخوں میں نمایاں ترقی کی، خاص طور پر امراض چشم کے علاج اور تحقیق کے میدان میں انہوں نے ایک نیا باب رقم کیا۔ مسلمانوں نے امراض چشم کو نہ صرف ایک طبی مسئلہ سمجھا بلکہ اس کو ایک باقاعدہ فن اور الگ علم کے طور پر ترقی دی۔ انہوں نے اس شعبے میں نئے طریقہ علاج، تشخیص کے اصول اور جراحی کی تکنیکوں کو متعارف کرایا، جس کے نتیجے میں یہ علم مزید مستحکم اور مؤثر ہوا۔

مسلم اطباء کی تحقیقات نے اس دور کے مختلف طبی مسائل کو حل کرنے کے لیے جدید طریقے وضع کیے، جنہیں بعد میں مشرق و مغرب کے اہل علم نے اپنایا۔ ان کی محنت اور تحقیق نے دنیا بھر میں امراض چشم کے علاج کے طریقوں کو نئے اُفق پر پہنچایا۔ اس دوران، مختلف مسلم طبیبوں نے آنکھوں کے مختلف امراض جیسے موتیا، نظر کی کمزوری، اور آنکھوں کی دیگر بیماریوں کے لیے نئی دواوں اور جراحی کے طریقے دریافت کیے، جو آج تک استعمال ہو رہے ہیں۔

یہ مسلم اطباء اپنے تحقیقی کاموں کے ذریعے دنیا بھر میں مقبول ہوئے، اور ان کے نظریات نے نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ یورپ میں بھی سائنسی اور طبی ترقی کی راہ ہموار کی۔ اس شعبے میں خاص طور پر ابنِ ہیثم، جو "مؤسس علم بصارت" کے طور پر جانے جاتے ہیں، نے اس علم کو نئی بنیادوں پر استوار کیا اور اس کی سائنسی تفصیلات کو واضح کیا۔ ان کی تحقیق نے نظر کے عمل کو سمجھنے میں انقلاب برپا کیا اور اس کے اثرات آج بھی علم بصارت کی تعلیمات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مسلم اطباء کی یہ تحقیقات اور سائنسی کام صدیوں تک مشرق و مغرب میں اہل علم کی رہنمائی کے طور پر کام کرتے رہے۔ ان کی تحقیق نے نہ صرف طب کے شعبے میں ترقی کی بلکہ انہوں نے جو علمی ذخیرہ چھوڑا، اس نے دنیا بھر میں سائنسی تحقیق کے معیار کو بلند کیا۔ ان کی محنت اور کارنامے آج بھی طب کے مختلف شعبوں میں انقلابی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کے کام کو جدید طب میں سراہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلم اطباء کی تحقیقات صدیوں تک مشرق و مغرب میں اہل علم کی رہنما رہیں:

Muslim physicians also added valuable knowledge to another branch of medicine, Ali ibn Isa wrote the famous work, Tadhkirat al-Kahhalin (Treasury of Ophthalmologists) and Abu Ruh Muhammad al-Jurani entitled Zarrindast (the Golden Hand) & Nur al-Ain (the Light of the Eye). The last book has served practitioners of the art for centuries. Ali ibn Isa's works were taught everywhere and even translated into Latin as Tractus de Oculis Jesu ben Hali. Many of the technical terms pertaining to ophthalmology in Latin as well as in some modern European languages, are of Arabic origin, and attest to the influence of Islamic sources on this subject.[1]

" مسلم اطباء نے امراضِ چشم کی دواسازی میں بھی بیش بہا علمی اضافے کئے۔ علی بن عیسیٰ نے انتہائی مشہور کتاب 'تذکرۃ الکحالین' لکھی ابو محمد الجرانی نے 'زریں دست' اور 'نورالعین' تصنیف کیں۔ اور موخر الذکر نے صدیوں تک ماہرین امراضِ چشم کی رہنمائی کی۔ علی بن عیسیٰ کی تصنیفات کو دنیا میں ہر جگہ پڑھایا گیا حتیٰ کہ Tractus de Oculis Jesu ben Hali کے نام سے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ بھی ہوا۔ امراضِ چشم سے وابستہ ایسی بہت سی فنی اِصطلاحات لاطینی زبان کے علاوہ دِیگر جدید یورپی زبانوں میں بھی اِستعمال ہو رہی ہیں، جن کا منبع عربی زبان ہے۔ اس سے ان موضوعات پر اسلامی اثرات کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔"

انیس تھیزیا (Anaesthesia) کے میدان میں بھی مسلمانوں کا کردار انتہائی اہم اور پیش رو رہا ہے۔ تاریخ میں علی بن عیسیٰ کو پہلا سائنسدان تسلیم کیا جاتا ہے جس نے سرجری سے پہلے مریض کو بے ہوش اور بے حس کرنے کے طریقے تجویز کیے۔ علی بن عیسیٰ کی یہ تحقیق نہ صرف سرجری کے دوران مریضوں کو درد سے نجات دینے کے لیے تھی بلکہ اس نے جراحی کی تکنیکوں میں انقلاب برپا کیا، اور ان کے طریقوں کا اثر بعد میں دنیا بھر میں محسوس کیا گیا۔[٢]

---

1 Syed Husain Nasr, *Islamic Science*, pp.166-167.

٢ ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ١:٣٣٣

اندلس کے مشہور سرجن ابو القاسم الزہراوی، جو اپنی جراحی کی مہارت کے لیے جانے جاتے ہیں، بھی اس عہد کے ایک عظیم طبیب تھے جنہوں نے مریض کو آپریشن سے پہلے بے ہوش کرنے کے طریقے کو بخوبی سمجھا اور استعمال کیا۔ الزہراوی نے اپنی کتاب التصریف میں اس بات کا ذکر کیا کہ کس طرح انہوں نے آپریشن سے پہلے مریض کو درد سے نجات دلانے کے لیے مختلف بے ہوشی کی ادویات استعمال کیں۔ ان کی اس تحقیق اور طریقہ کار نے جراحی کے شعبے میں ایک نیا معیار قائم کیا اور یہ دنیا بھر میں سرجری کے دوران انیستھیزیا کے استعمال کی بنیاد بن گیا۔

اسی عہد میں تیونس میں ایک اور ماہر، اسحاق بن سلیمان الاسرائیلی، بھی منظرِ عام پر آئے، جو امراضِ چشم کے ماہر تھے۔ ان کا کام نہ صرف نظر کی بیماریوں کے علاج میں انقلابی تھا بلکہ انہوں نے انیستھیزیا کے میدان میں بھی اہم تحقیق کی۔ اسحاق بن سلیمان کی تصنیفات کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی زبانوں میں کیا گیا، جس سے ان کے علم کا پھیلاؤ یورپ میں بھی ہوا۔ ان کی تحقیقات اور نظریات نے مغربی دنیا کو علمِ جراحی اور انیستھیزیا کے نئے طریقوں سے روشناس کرایا۔

مسلمان سائنسدانوں اور اطباء نے انیس تھیزیا کے میدان میں جو جدت اور تحقیق کی، وہ نہ صرف اپنے دور کے لیے اہم تھی بلکہ اس کا اثر آج تک طب کے مختلف شعبوں میں محسوس کیا جاتا ہے۔ ان کی دریافتوں نے سرجری کو زیادہ محفوظ، مؤثر اور درد سے آزاد بنایا، اور ان کا یہ علمی ورثہ آج بھی طب کی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید حسین نصر لکھتے ہیں:

> Ali ibn Isa was also the first person to propose the use of anaesthesia for surgery. Another person appeared at this time in Tunis, Ishaq ibn Sulaiman al-Israili, who practised ophthalmology and his works were also translated into Latin and Hebrew languages.[1]

---

① Syed Husain Nasr, *Islamic Science*, p. 178.

"علی ابن عیسی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے سرجری کے لیے بے ہوشی کی دوا استعمال کرنے کی تجویز پیش کی۔ اسی دوران تیونس میں ایک مسلم اہل علم اسحاق بن سلیمان الاسرائیلی تھے، جو امراض چشم کے ماہر تھے اور ان کی تخلیقات کا لاطینی اور عبرانی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا تھا۔"

مسلمانوں کے علوم و فنون کے مغرب پر اثرات کا اندازہ ان بے شمار الفاظ اور اصطلاحات سے لگایا جا سکتا ہے جو آج بھی مغربی علوم، فنون اور روزمرہ کی زبانوں میں مستعمل ہیں۔ یہ اصطلاحات نہ صرف مسلمانوں کے علمی اور سائنسی ورثے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ یہ بھی ثابت کرتی ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت نے مغرب کے فکری اور ثقافتی ڈھانچے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

مثال کے طور پر، لفظ arsenal (مصنع اسلحہ) جو کہ اسلحہ کے ذخیرہ گاہ یا کارخانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی لفظ "دار السلاح" سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح، admiral (امیر البحر) جو بحری افسر کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی لفظ "امیر البحر" سے آیا ہے۔ cable (الکبل) جو تار یا رسی کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی لفظ "کبل" سے اخذ کیا گیا ہے، اور monsoon (مون سون) جو موسمی طوفان کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی لفظ "موسم" سے ماخوذ ہے۔

اسی طرح Earth (ارض) کا لفظ بھی عربی زبان سے آیا ہے، جو زمین کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور Gibraltar (جبل طارق) جو مشہور جغرافیائی مقام کا نام ہے، یہ بھی عربی لفظ "جبل طارق" سے لیا گیا ہے۔ Influenza (انزال الانف) جو بیماری کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کا بھی عربی لفظ "انزال" سے تعلق ہے۔ Base (بئس) جو کسی ادارے یا جگہ کے لیے بنیادی مقام یا بنیاد کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی لفظ "بئس" سے آیا ہے۔ Canon (قانون) جو اصول یا قاعدے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہ بھی عربی "قانون" سے ماخوذ ہے۔

اسی طرح Quadalquivir (وادی الکبیر) جو ایک مشہور دریا کا نام ہے، یہ بھی عربی زبان سے لیا گیا ہے۔ Almanac (المانک) جو سالانہ موسمی یا فلکیاتی پیش گوئیوں کی کتاب

کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی "المناخ" سے آیا ہے۔ آخر میں، Astrolabe (اسطرلاب) جو ایک قدیم فلکیاتی آلہ ہے، عربی لفظ "اسطرلاب" سے اخذ کیا گیا ہے۔

یہ بے شمار عربی الاصل الفاظ اور اصطلاحات جدید مغربی دنیا میں استعمال ہو رہی ہیں، جو مسلمانوں کی سائنسی اور ثقافتی کامیابیوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان اصطلاحات کا مغربی دنیا میں استعمال اس بات کا غماز ہے کہ مسلمانوں کی علم و ثقافت نے مغربی تمدن کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے، اور ان کی تحقیقات اور نظریات آج بھی جدید دنیا میں زندہ ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغربی کلچر اور سائنسی ترقی میں مسلم علم و حکمت کا اثر گہرا اور مستقل ہے۔

مسلمانوں کی سائنسی ترقی کی عالمگیر اہمیت

قرونِ وسطیٰ میں اسلامی اور عرب دنیا میں شرحِ خواندگی اور تعلیم و تعلم کا ایسا ارتقاء ہوا کہ یہ ایک حیرت انگیز حد تک ترقی کر گیا۔ ایک چھوٹے سے شہر جیسے سسلی (Sicily) میں بھی ۶۰۰ پرائمری سکول موجود تھے، اور ان سکولوں کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ابو القاسم بلخی کی روایت کے مطابق، صرف اُن کے اپنے تعلیمی ادارے میں ۳۰۰۰ طلبہ زیرِ تعلیم تھے۔ یہ اس بات کا غماز ہے کہ تعلیم و تعلم کے شعبے میں مسلمانوں نے کس قدر ترقی کی تھی اور وہ علم کی روشنی کو ہر سطح پر پھیلا رہے تھے۔

اسی طرح، مشرقی دنیا کے دیگر بڑے شہر جیسے دمشق (Damascus) ، حلب (Halab)، بغداد (Baghdad) ، موصل (Mosul) ، مصر (Egypt) ، بیت المقدس (Jerusalem)، بعلبک (Baalbek) ، قرطبہ (Cordoba) ، نیشاپور اور خراسان (Central Asia) بھی تعلیمی اداروں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان شہروں میں تعلیمی ادارے نہ صرف علم و حکمت کا مرکز تھے بلکہ انہوں نے جدید سائنسی اور فلسفیانہ تحقیق کی بنیاد بھی رکھی۔

اس دور کی سب سے عظیم تعلیمی اداروں میں سے ایک "جامعہ نظامیہ بغداد" تھی، جو پانچویں صدی سے نویں صدی ہجری تک دنیا کی سب سے بڑی اور عظیم یونیورسٹی سمجھی جاتی

تھی۔ اس یونیورسٹی میں ریگولر طلبہ کی تعداد ۶۰۰۰ تک پہنچتی تھی، اور یہاں مختلف شعبوں میں علم کی اعلیٰ ترین تعلیم دی جاتی تھی۔ جامعہ نظامیہ بغداد میں فقہ، طب، فلسفہ، ریاضی، اور دیگر سائنسی علوم کے ماہر اساتذہ نے تدریس کی، اور یہ ادارہ دنیا بھر سے طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔[1]

یہ سب اعداد و شمار اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں اسلامی دنیا میں تعلیم کا معیار نہ صرف بہت بلند تھا بلکہ یہ دنیا کے دیگر خطوں کے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان تعلیمی اداروں نے علمی ترقی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کی فکری بنیادیں بھی مضبوط کیں، جو بعد میں مغربی دنیا میں بھی سائنسی اور فلسفیانہ ترقی کی راہ ہموار کرنے کا سبب بنیں۔

دسویں صدی میں، امام نعیمیؒ کے مطابق، شہر دمشق میں فقہ و قانون (law and jurisprudence) کے تعلیمی اداروں کا منظر بہت متنوع اور وسیع تھا۔ دمشق میں اس وقت ۶۳ تعلیمی ادارے فقہ شافعی کے تھے، ۵۲ فقہ حنفی کے، ۱۱ فقہ حنبلی کے اور ۴ فقہ مالکی کے تھے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت فقہ اور قانون کی تعلیم کی کتنی اہمیت تھی اور اس شعبے میں مختلف مکاتبِ فکر کا کتنا اثر و رسوخ تھا۔ اس کے علاوہ، دمشق میں علمِ طب (medical sciences) کے مختلف سکول اور کالجز بھی موجود تھے، جو طب کی تعلیم میں اپنی نوعیت کے حوالے سے منفرد اور اہم تھے۔

اسی دور میں، امام ابنِ کثیرؒ نے اپنی مشہور کتاب البدایہ والنہایہ میں ۶۳۱ ہجری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسی سال بغداد میں "مدرسہ مستنصریہ" کی تعمیر مکمل ہوئی، جو اُس وقت کی قانون کی سب سے بڑی درسگاہ تھی۔ یہ مدرسہ اپنے وقت کا ایک نمایاں تعلیمی مرکز تھا جہاں فقہ اور قانون کے شعبے میں گہری مہارت رکھنے والے ماہرین و اساتذہ تدریس کرتے تھے۔ مدرسہ مستنصریہ میں چاروں فقہی مکاتبِ فکر (شافعی، حنفی، حنبلی اور مالکی) کے ماہرین و متخصّصین فقہ و قانون کے مختلف شعبوں میں تدریس کے لیے تعینات تھے۔ اس طرح یہ مدرسہ نہ صرف اسلامی فقہ کے مختلف نظریات اور مکاتبِ فکر کو سمجھنے کا ایک عظیم مرکز تھا،

1 Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, pp. 408-415.

بلکہ یہاں کے اساتذہ اور ماہرین نے اسلامی قانون کی تحقیق اور تدریس میں ایک اہم کردار ادا کیا۔[1]

یہ ادارے اور ان کی تعلیمات اس بات کا غماز ہیں کہ دسویں صدی میں اسلامی دنیا میں علم و حکمت کی سطح کتنی بلند تھی اور فقہ و قانون کے شعبے میں کس قدر ترقی ہو چکی تھی۔ دمشق اور بغداد جیسے شہروں میں قائم ان تعلیمی اداروں نے نہ صرف اسلامی فقہ اور قانون کو ایک نئی شکل دی بلکہ اس کے اثرات پورے عالم اسلام میں پھیل گئے اور اس وقت کے تعلیمی معیار کا ایک مثالی نمونہ بنے۔

اسلامی تاریخ میں پہلا باقاعدہ ہسپتال اُموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دور میں ۸۶ ہجری سے ۹۶ ہجری تک، پہلی صدی ہجری میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سے قبل مختلف طبی سہولتیں، جیسے ڈسپنسریاں، موبائل میڈیکل یونٹ اور میڈیکل ایڈ سینٹرز، موجود تھے جنہوں نے عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں غزوہ خندق کے دوران بھی مدینہ طیبہ میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ تاہم، ولید بن عبد الملک کے دور میں پہلا باقاعدہ ہسپتال قائم ہوا، جو نہ صرف علاج کی سہولت فراہم کرتا تھا بلکہ طبی علوم کو ایک منظم اور جامع طریقے سے پیش کرتا تھا۔ اس ہسپتال میں مریضوں کے لیے باقاعدہ وارڈز تھے، اور ڈاکٹروں کو رہائش فراہم کی جاتی تھی ساتھ ہی انہیں معقول تنخواہیں بھی دی جاتیں تھیں۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں قائم ہونے والے ان ہسپتالوں میں متعدد شعبہ جات متعارف کرائے گئے، جو بعد میں عالمی سطح پر طبی علوم کے مختلف میدانوں میں انقلاب لانے کا سبب بنے۔ ان شعبہ جات میں شامل تھے:

۱. Department of Systematic Diseases (منظم بیماریوں کا شعبہ)
۲. Ophthalmic Department (چشم کے امراض کا شعبہ)
۳. Surgical Department (جراحی کا شعبہ)
۴. Orthopaedic Department (ہڈیوں کے امراض کا شعبہ)

---

[1] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۱۳: ۱۳۹

۵. Department of Mental Diseases (دماغی امراض کا شعبہ)

ان میں سے کئی بڑے ہسپتالوں کے ساتھ میڈیکل کالجز بھی قائم کیے گئے، جہاں پوری دنیا سے طلبہ میڈیکل سائنس کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ دمشق کا "نوری ہسپتال" (Noorie Hospital) اور مصر کا "ابنِ طولون ہسپتال" (Ibn-i-Tulun Hospital) ان اداروں میں نمایاں تھے، جہاں جدید سائنسی اور طبی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابنِ طولون ہسپتال میں ایک عظیم لائبریری بھی موجود تھی، جس میں صرف طبی علوم پر مبنی ایک لاکھ سے زائد کتابیں رکھی گئی تھیں۔

ان ہسپتالوں کا نظام جدید مغربی ہسپتالوں کی طرح نہایت منظم اور جامع تھا۔ ان اداروں میں طبی سہولتوں کے تمام پہلوؤں کو یکجا کیا گیا تھا، جس میں علاج، تحقیق اور تعلیم شامل تھی۔ ان ہسپتالوں نے نہ صرف اپنے اپنے علاقوں میں بلکہ پورے مسلم دنیا میں معیار قائم کیا۔ دمشق، بغداد، قاہرہ، بیت المقدس، مکہ، مدینہ اور اندلس جیسے شہروں میں یہ معیار برقرار رکھا گیا تھا۔

خصوصاً بغداد کا "اَزدی ہسپتال" (Azdi Hospital) جو ۳۷۱ ہجری میں تعمیر ہوا، دمشق کا "نوری ہسپتال" (Noorie Hospital)، مصر کا "منصوری ہسپتال" (Mansuri Hospital) اور مراکش کا "مراکو ہسپتال" (Moroccan Hospital) ان دور کے سب سے بڑے اور تمام ضروری طبی سہولتوں اور آلات سے لیس ہسپتال تھے۔ ان ہسپتالوں میں مریضوں کو علاج کی بہترین سہولتیں فراہم کی جاتیں اور طبی تعلیم کا اعلیٰ معیار بھی قائم تھا۔ ان اداروں کی بدولت اسلامی دنیا نے نہ صرف صحت کی سہولتوں میں انقلاب برپا کیا بلکہ عالمی سطح پر طب کی تعلیم و تحقیق میں بھی اہم کردار ادا کیا۔[1]

اسلامی تعلیمات کی بدولت مسلمانوں نے تعلیم اور صحت کے میدانوں میں نمایاں ترقی حاصل کی، اور یہ ترقی اتنی شاندار تھی کہ مسلمان اس دور میں علم و فنیات کے لحاظ سے ایک بلند مقام پر فائز تھے۔ اس کے برعکس، یورپ کے بیشتر علاقوں میں لوگوں کو بنیادی

---

1 Philip K. Hitti, *The Arabs: A Short History*, p. 143., Howard H. Turner, *Science in Medieval Islam: An illustrated Introduction*, pp. 142-143.

ضروریات، جیسے صاف پینے کا پانی بھی میسر نہیں تھا، اور وہ صحت کی بنیادی سہولتوں سے محروم تھے۔ مسلمانوں کی علمی دلچسپی اور تحقیق کا یہ عالم تھا کہ ان کی دنیا بھر میں قائم لائبریریوں نے تعلیم کے معیار اور حجم کو ایک نئی بلندی تک پہنچایا۔

اسلامی دنیا کے ہر شہر میں پبلک اور پرائیویٹ لائبریریوں کی قابلِ رشک تعداد موجود تھی، جو علم کے خزانے کا ذخیرہ سمجھی جاتی تھیں۔ یہ لائبریریاں نہ صرف ایک ثقافتی اور علمی مرکز کا کردار ادا کرتی تھیں بلکہ ایک تعلیم یافتہ معاشرہ بنانے کی بنیاد بھی فراہم کرتی تھیں۔ ان لائبریریوں میں لاکھوں کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا، جو مختلف علوم، فنون، فلسفہ، سائنسی تحقیقات، اور ادب پر مشتمل تھا۔ قرطبہ (Cordoba) ، غرناطہ (Granada) ، بغداد (Baghdad)، طرابلس (Tarabulus) اور دیگر شہر اس دور کے عظیم علمی مراکز تھے جہاں لائبریریوں کا شمار دُنیا کے عظیم تاریخی اور علمی سرمائے میں کیا جاتا تھا۔[1]

قرطبہ کی لائبریری کو خاص طور پر علمی اور ثقافتی تاریخ کا ایک اہم ستون سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے علمی ذخیرے نے نہ صرف اسلامی دنیا کو فائدہ پہنچایا بلکہ اس علم کو یورپ تک بھی پہنچایا، جس نے بعد میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ بغداد کی دارالعلوم، غرناطہ کی لائبریریاں اور طرابلس میں موجود کتب خانوں نے علم کے پیاسوں کو سیراب کیا اور علمی ترقی کے نئے دروازے کھولے۔ ان لائبریریوں میں موجود مواد نے سائنسی اور فلسفیانہ تحقیقات میں انقلاب لایا، اور یہ مسلمانوں کے علمی ورثے کی نشاندہی کرتے ہیں جنہوں نے نہ صرف اسلامی دنیا میں بلکہ عالمی سطح پر علم و حکمت کی روشنی پھیلائی۔

مسلمانوں کی ان کوششوں کی بدولت اسلامی دنیا نے نہ صرف اپنے معاشرتی و علمی ڈھانچے کو مضبوط کیا بلکہ پوری انسانیت کو ایک نئے علمی دور کی طرف رہنمائی فراہم کی۔ اس کی بدولت علم و فہم کے نئے افق کھلے، اور مسلمانوں نے اپنی تہذیب و ثقافت کو ایک عالمی سطح پر نمایاں کیا۔

مسلم دنیا میں تشکیل پانے والی علمی، فکری اور سائنسی روایت نے نہ صرف مسلمانوں کی دنیاوی اور مادی زندگی کو نئی جہت دی بلکہ ان کے ذہنی رجحانات میں بھی مثبت تبدیلیاں

1 Donald R. Hill, *Islamic Science and Engineering*, pp. 171-172.

لائیں۔ اس علمی ترقی نے مسلمانوں کو ایک ایسے دور میں داخل کیا جہاں محض نظریاتی یا تخیلاتی زاویہ نظر کی بجائے، ہر شعبے میں عملی اور تجرباتی طرز فکر کو اپنانا شروع کیا گیا۔ اس طرح مسلمانوں نے اپنے معاشرتی، سائنسی، فلسفیانہ، اور تہذیبی مسائل کو حل کرنے کے لیے تجربات اور مشاہدات پر زور دیا، جس سے مختلف میدانوں میں انقلابی ترقیات ہوئیں۔

اس تبدیلی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے علم و حکمت کے حصول کے لیے ایک سائنسی طریقہ کار اپنایا جس میں مشاہدہ، تجربہ، تجزیہ، اور منطقی استدلال کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہ عملی طرز فکر نے انہیں نہ صرف مادی دنیا کو بہتر بنانے میں مدد دی بلکہ ان کے ذہنی افق کو بھی وسیع کیا اور ان کے فکری رجحانات کو ایک زیادہ متوازن اور حقیقت پسندانہ سمت میں ڈالا۔ اس علمی ماحول نے مسلمانوں کے ذہنوں کو آزادی دی اور انہیں چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا۔

مشہور مغربی محقق ہیملٹن گب (Hamilton A. R. Gibb) نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسلامی دنیا میں جو علمی اور فکری روایت پروان چڑھی، اس نے مسلمانوں کو ایک نئی فکری سوچ فراہم کی، جو محض خیالات یا تخیلات سے بالاتر تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی اس علمی کوشش کو سراہتے ہوئے لکھا کہ اسلامی دنیا نے اپنے نظریات اور علم کو تجرباتی بنیادوں پر استوار کیا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے ہر شعبے میں تحقیق اور اختراع کو فروغ دیا۔

گب کے مطابق، اس علمی روایت کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کو سائنسی تحقیق اور فلسفے کی نئی راہوں پر گامزن کیا اور ان کے ذہنی رویوں میں ایک منطقی اور حقیقت پسندانہ تنقید و تجزیے کی صلاحیت پیدا کی۔ اس طرز فکر نے مسلمان معاشروں میں سائنسی ترقی، فلسفے، طب، ریاضی، فلکیات، اور دیگر علوم میں بے شمار اہم کامیابیاں حاصل کرنے کا باعث بنی۔ اس طرح، اسلامی تہذیب نے نہ صرف اپنے زمانے کو ترقی دی بلکہ دنیا بھر کے علم و فہم کی بنیاد بھی رکھی۔ گب لکھتا ہے:

> It is difficult to indicate in a few words the many-sided intellectual activities of this age. The older 'Muslim sciences' of history and philology broadened out to

embrace secular history and belleslettres. Greek medical and mathematical science were made accessible in a library of translations and were developed by Persian and Arab scholars, especially in algebra, trigonometry, and optics. Geography--perhaps the most sensitive barometer of culture-flowered in all its branches, political, organic, mathematical, astronomical, natural science, and travel, and reached out to embrace the lands of civilizations of far-distant peoples.

While these new sciences touched only the fringes of the religious culture, the inroads of Greek logic and philosophy inevitably produced a sharp and bitter conflict, which came to a head in the third Islamic century. The leaders of Islam saw its spiritual foundations endangered by the subtle infidelities of pure rationalism, and although they ultimately triumphed over the Hellenizing school, philosophy always remained an object of suspicion in their eyes, even when it came to be studied merely as an apologetic tool.[1]

"اس دور کی کثیر الجہات علمی سرگرمیوں کو چند الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ مسلمانوں کا قدیم علم تاریخ اور لسانیات سیکولر تاریخ اور ادبی فن پاروں سے مل کر وسعت پذیر ہو گئے۔ ایک دارالترجمہ میں یونانی طب اور ریاضی کے علم کو قابل رسائی بنایا گیا اور ایرانی اور عرب سکالروں نے الجبراء، تکونیات اور بصریات کو فروغ دیا۔ جغرافیہ جو کہ کلچر کا بہت ہی حساس پیمانہ ہے اپنی تمام شاخوں میں فروغ پذیر ہوا جن میں اس کے سیاسی، نامیاتی، ریاضیاتی، فلکیاتی، فطری اور سفر کے پہلو شامل ہیں اور یہ ترقی کرتا ہوا دور دراز لوگوں کی تہذیب کی زمین تک پہنچ گیا۔

"جب نئی سائنسوں کا مذہبی کلچر کی حدود کے ساتھ محض میل جول ہی پیدا ہوا تو یونانی منطق اور فلسفہ نے ناگزیر طور پر بہت ہی واضح اور شدید تنازعات پیدا کئے جو تیسری صدی ہجری میں منظر عام پر آ گئے۔ اسلام کے رہنماؤں نے محسوس کیا کہ خالص عقلیت کی غیر محسوس کا فرانہ روش کے باعث اسلام کی روحانی بنیادیں معرض خطر میں ہیں اور اگرچہ انہوں نے

---

1 Hamilton A. R. Gibb, *Mohammedanism: An Historical Survey*, p. 5, 6.

آخر کار ہیلنیائی طبقے کو فتح کر لیا مگر اس کے (غیر حقیقی و غیر تجربی) فلسفے کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا حتی کہ اسے صرف ایک معاون فن کے طور پر پڑھا گیا۔"

مسلمانوں کا اصول انسانیت نوازی

مسلمانوں نے جس تمدن کی بنیاد رکھی، وہ علم و حکمت، عدل و انصاف اور انسانیت نوازی پر استوار تھا۔ اس تہذیب میں ہر شعبے میں ترقی کی راہ ہموار کی گئی، جہاں علم کا حصول اور اس کا پھیلاؤ ایک عظیم مقصد سمجھا گیا، اور جہاں عدل و انصاف کی اہمیت کو تمام معاشرتی پہلوؤں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مسلمانوں کی تہذیب نے نہ صرف سائنسی و فکری ترقی کو فروغ دیا بلکہ انہوں نے انسانی حقوق، انصاف اور مساوات کی بنیاد پر ایک ایسا معاشرتی نظام تشکیل دیا جس نے دنیا بھر کے لوگوں کو متاثر کیا۔

مسلمانوں کے دورِ عروج میں عدل اور انصاف کا معیار بہت بلند تھا، اور اس کی حقیقی مثال حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکمرانی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور تاریخ میں ایک سنہری دور کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، جس میں عدل و انصاف کی نہ صرف حکومتی سطح پر بلکہ عوامی زندگی میں بھی بھرپور ترویج ہوئی۔ ان کی حکومت میں، ہر شخص کے ساتھ انصاف کیا جاتا تھا، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکمرانی میں ایک اہم واقعہ پیش آیا جس سے ان کی عدلیہ کی پختگی اور انسانیت نوازی کا پتہ چلتا ہے۔

ثمرقند کی فتح کے بعد، ایک قاصد جو طویل سفر طے کر کے آیا تھا، سلطنت اسلامیہ کے حکمران حضرت عمر بن عبدالعزیز سے ملاقات کے لیے دارالخلافہ پہنچا۔ اس قاصد کے پاس ایک خط تھا، جس میں غیر مسلم پادری نے مسلمان سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کی شکایت کی تھی۔ پادری نے شکایت کی تھی کہ قتیبہ بن مسلم نے شہر میں موجود غیر مسلموں پر ظلم و زیادتی کی تھی اور انہیں اپنے مذہبی حقوق سے محروم کر دیا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس شکایت کو سنجیدگی سے لیا اور فوری طور پر ایک انکوائری شروع کی۔ انہوں نے نہ صرف اس معاملے کی تحقیق کرنے کی ہدایت دی بلکہ یہ

بھی یقینی بنایا کہ اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ تمام لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق سلوک کیا جائے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ ان کے دورِ حکمرانی میں ایسا کوئی بھی ظلم برداشت نہیں کیا جاتا تھا جو کسی کے حقوق کی خلاف ورزی کرتا ہو۔ اس واقعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا حکومت چلانے کا طریقہ نہ صرف عدلیہ کے انصاف پر مبنی تھا بلکہ اس میں انسانیت اور مذہبی رواداری بھی نمایاں تھی۔

یہ واقعہ مسلمانوں کے عدل و انصاف کے نظام کی مثال پیش کرتا ہے، جہاں ہر فرد کو انصاف ملتا تھا اور کسی کے ساتھ ناانصافی کا تصور بھی نہیں تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کی حکمرانی میں، مسلمان معاشرے نے یہ سبق سیکھا کہ عدل و انصاف صرف حکومتی سطح پر نہیں، بلکہ اس کا اطلاق ہر فرد کی روزمرہ زندگی میں بھی ہونا چاہیے۔ یہ ان کے دور کا سب سے اہم اصول تھا جس نے اس عہد کو تاریخ کے سنہری ادوار میں شامل کیا۔ پادری نے خط میں لکھا:

ہم نے سنا تھا کہ مسلمان جنگ اور حملے سے پہلے قبول اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر دعوت قبول نہ کی جائے تو جزیہ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر کوئی ان دونوں شرائط کو قبول کرنے سے انکار کرے تو جنگ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں. مگر ہمارے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا اور ہم پر راتوں رات اچانک حملہ کر کے ہمیں مفتوح کر لیا گیا ہے۔

یہ خط ثمر قند کے سب سے بڑے پادری نے سلطنت اسلامیہ کے فرماں روا عمر بن عبد العزیز کے نام لکھا تھا۔ دمشق کے لوگوں سے شہنشاہ وقت کی قیام گاہ کا معلوم کرتے کرتے وہ قاصد ایک ایسے گھر جا پہنچا کہ جو انتہائی معمولی اور خستہ حالت میں تھا۔ ایک شخص دیوار سے لگی سیڑھی پر چڑھ کر چھت کی لپائی کر رہا تھا اور نیچے کھڑی ایک عورت گارا اُٹھا کر اُسے دے رہی تھی۔ جس راستے سے آیا تھا واپس اُسی راستے سے اُن لوگوں کے پاس جا پہنچا جنہوں نے اُسے راستہ بتایا تھا۔

اس نے لوگوں سے کہا میں نے تم سے اسلامی سلطنت کے بادشاہ کا پتہ پوچھا تھا نہ کہ اِس مفلوک الحال شخص کا جس کے گھر کی چھت بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔

لوگوں نے کہا: ”ہم نے تجھے پتہ ٹھیک ہی بتایا تھا، وہی حاکم وقت عمر بن عبد العزیز کا گھر ہے۔“ قاصد پر مایوسی چھا گئی اور بے دلی سے دوبارہ اُسی گھر پر جا کر دستک دی، جو شخص کچھ دیر پہلے تک لپائی کر رہا تھا وہی اندر سے نمودار ہوا۔ قاصد نے اپنا تعارف کرایا اور خط عمر بن عبد العزیز کو دے دیا۔

عمر بن عبد العزیز نے خط پڑھ کر اُسی خط کی پشت پر لکھا:

من عبد الله عمر بن عبد العزيز إلى عامله في سمرقند أن انصب قاضياً ينظر فيما ذكروا، ثم ختمها وناولنيها.[1]

عمر بن عبد العزیز کی طرف سے سمرقند میں تعینات اپنے عامل کے نام: ”ایک قاضی کا تقرر کرو، جو پادری کی شکایت سنے۔“ مہر لگا کر خط واپس قاصد کو دے دیا۔

سمرقند لوٹ کر قاصد نے خط کا جواب اور ملاقات کا احوال جب پادری کو سنایا، تو پادری پر بھی مایوسی چھا گئی۔ اس نے سوچا کہ کیا یہ وہ خط ہے جو مسلمانوں کے اُس عظیم لشکر کو ہمارے شہر سے نکالے گا؟ اُنہیں یقین تھا کاغذ کا یہ ٹکڑا اُنہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ مگر کوئی اور راستہ بھی نہ تھا چنانچہ خط لے کر ڈرتے ڈرتے امیر لشکر اور حاکم ثمرقند قتیبہ بن مسلم کے پاس پہنچے۔ قتیبہ نے خط پڑھتے ہی فوراً ایک قاضی کا تعین کر دیا جو اس کے اپنے خلاف سمرقندیوں کی شکایت سن سکے۔

قاضی نے پادری سے پوچھا، تمہارا کیا دعویٰ ہے؟ پادری نے کہا: قتیبہ نے بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ہم پر حملہ کیا، نہ تو اِس نے ہمیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور نہ ہی ہمیں کسی سوچ وبچار کا موقع دیا تھا۔

قاضی نے قتیبہ کو دیکھ کر پوچھا، کیا کہتے ہو تم اس دعویٰ کے جواب میں؟

قتیبہ نے کہا: قاضی صاحب، جنگ تو ہوتی ہی فریب اور دھوکہ ہے۔

---

[1] بلاذری کی فتوح البلدان میں ہے: فكتب عمر إلى عامله يأمره أن ينصب لهم قاضيا ينظر فيما ذكروا فإن قضى باخراج المسلمين [ترجمہ: حضرت عمرؓ نے اپنے عامل کو لکھا کہ وہ ان کے لیے ایک قاضی مقرر کرے جو اُن کے بیان کردہ معاملے کو دیکھے، اور اگر قاضی مسلمانوں کے انخلاء کا فیصلہ کرے تو اُس پر عمل کیا جائے۔] (بلاذری، فتوح البلدان، ص ۴۱۱)۔

سمرقند ایک عظیم ملک تھا، اس کے قرب و جوار کے کمتر ملکوں نے نہ تو ہماری کسی دعوت کو مان کر اسلام قبول کیا تھا اور نہ ہی جزیہ دینے پر تیار ہوئے تھے، بلکہ ہمارے مقابلے میں جنگ کو ترجیح دی تھی۔

سمرقند کی زمینیں تو اور بھی سرسبز و شاداب اور زور آور تھیں، ہمیں پورا یقین تھا کہ یہ لوگ بھی لڑنے کو ہی ترجیح دیں گے، ہم نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور سمرقند پر قبضہ کر لیا۔

قاضی نے قتیبہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا: قتیبہ میری بات کا جواب دو، تم نے ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت، جزیہ یا پھر جنگ کی خبر دی تھی؟

قتیبہ نے کہا: نہیں قاضی صاحب، میں نے جس طرح پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ ہم نے موقع سے فائدہ اُٹھایا تھا۔

قاضی نے کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی غلطی کا اقرار کر رہے ہو، اس کے بعد تو عدالت کا کوئی اور کام رہ ہی نہیں جاتا۔

اللہ نے اس دین کو فتح اور عظمت تو دی ہی عدل و انصاف کی وجہ سے ہے نہ کہ دھوکہ دہی اور موقع پرستی سے۔

میری عدالت یہ فیصلہ سناتی ہے کہ تمام مسلمان فوجی اور ان کے عہدہ داران مع اپنے بیوی بچوں کے، اپنی ہر قسم کی املاک اور مال غنیمت چھوڑ کر سمرقند کی حدوں سے باہر نکل جائیں اور سمرقند میں کوئی مسلمان باقی نہ رہنے پائے۔

اگر ادھر دوبارہ آنا بھی ہو تو بغیر کسی پیشگی اطلاع و دعوت کے اور تین دن کی سوچ و بچار کی مہلت دیئے بغیر نہ آیا جائے۔

پادری جو کچھ دیکھ اور سن رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر ہی مسلمانوں کا عظیم لشکر قافلہ در قافلہ شہر کو چھوڑ کے جا چکا تھا۔

ثمرقندیوں نے اپنی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جب طاقتور فاتح قوم کمزور مفتوح قوم کو یوں دوبارہ آزادی بخش دے۔

ڈھلتے سورج کی روشنی میں لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے کہ یہ کیسا مذہب اور کیسے پیروکار ہیں۔ عدل کا یہ معیار کہ اپنوں کے خلاف ہی فیصلہ دے دیں۔ اور طاقتور سپہ سالار اس فیصلہ پہ سر جھکا کر عمل بھی کر دے۔

تاریخ گواہ ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں پادری کی قیادت میں تمام شہر کے لوگ گھروں سے نکل کر لشکر کے پیچھے سرحدوں کی طرف دوڑے اور لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتے ہوئے اُن کو واپس لے آئے کہ یہ آپ کی سلطنت ہے اور ہم آپ کی رعایا بن کر رہنا اپنے لئے فخر سمجھیں گے۔ اسلام نے وہاں ایسے نقوش چھوڑے کہ سمرقند ایک عرصہ تک مسلمانوں کا دارالخلافہ بنا رہا۔[1]

---

[1]۔ عمر واسماعیل محمد، عمر بن عبد العزیز – عدله وزهده وحكمته، وكالة الصحافة العربية، مصر، ۲۰۲۱ء، ص ۱۳۰ – ۱۳۳۔

(۴)

سماں 'الفُقرَ و فَخرِی' کا رہا شانِ امارت میں

۴۔الفقر فخری

یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث کی جانب اشارہ ہے کہ "فقر میرے لیے باعث فخر ہے"[۱]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فقراء کی رفاقت کو اغنیاء کی مجلس سے زیادہ پسند فرماتے تھے اور انہیں کے حلقے میں زندہ رہنے اور انہیں کے گروہ میں وفات پانے کی دعا بھی فرمائی۔

علامہ اقبال کی فکر میں فقر کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری اور فلسفہ میں فقر کو روحانیت، خودی اور حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ علامہ اقبال جس مرد قلندر اور مرد مومن کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں، وہ دراصل فقر کے حامل کردار سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ ان کے مطابق، فقر نہ صرف مادی دنیا سے بیگانگی ہے، بلکہ یہ انسان کی روحانی بیداری اور حقیقی عظمت کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ علامہ اقبال کی نظر میں فقر وہ قوت ہے جو انسان کو دنیاوی لذتوں اور آرام کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرتی ہے، اور اسے اللہ کے قریب کر دیتی ہے، جو اس کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

اگر علامہ اقبال نے نوجوانوں کے لیے شاہین کو اپنے مثالی کردار کے طور پر پیش کیا ہے، تو اس کا سبب یہ ہے کہ شاہین میں فقر کے وہ بنیادی اوصاف موجود ہیں جو علامہ اقبال کی نظر میں انسان کی روحانی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔ شاہین کی تصویر علامہ اقبال کے فلسفۂ

---

[۱]۔ ابن حجر عسقلانی، التلخیص الحبییر، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج ۳، ص ۲۴۱، حدیث نمبر ۱۴۱۶۔

خودی اور بلند خیالات کے عین مطابق ہے۔ شاہین کا کردار خودی کی بلند پروازی، آزاد خیالی، اور مقصد کے حصول کے لیے جستجو کی علامت ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو فقر کے حامل کردار میں پائی جاتی ہیں، کیونکہ فقر انسان کو اپنی خودی کی گہرائیوں میں جھانکنے اور ایک بلند مقصد کے لیے جینے کی ترغیب دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس حوالے سے مولوی ظفر احمد صدیقی کو مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کے اپنے خط میں اس بات کا ذکر کیا کہ فقر کے حامل افراد میں شاہین کے اوصاف ہوتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ ''شاہین کا کردار فقر کے بنیادی اصولوں پر استوار ہے۔ وہ نہ صرف دنیا کی آسائشوں سے آزاد ہوتا ہے بلکہ اپنی بلند پروازی اور بلند مقصد کی تکمیل کے لیے ہمیشہ جستجو کرتا رہتا ہے۔'' اقبال کے مطابق، شاہین کی طرح فقر بھی انسان کو اپنی تقدیر کا خود معمار بناتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس عظیم کردار کو نوجوانوں کے لیے آئیڈیل قرار دیا ہے۔ یہ تمام پہلو اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کے فکر میں فقر کا مقام نہ صرف روحانیت کی بلندی کے طور پر ہے بلکہ یہ انسان کی خودی اور شخصیت کو ایک نئی جہت دینے کا وسیلہ بھی ہے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے مولوی ظفر احمد صدیقی کو لکھا:

> شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں، اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ (۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔[۱]

علامہ اقبال کی اپنی زندگی بھی فقر کے اسی تصور کی عکاس تھی یعنی علامہ اقبال کی فکر کی مقبولیت اس بات کی گواہ ہے کہ ان کی فکر ظاہری اسباب کے بجائے تائید خداوندی کے ذریعے مسلمانانِ برصغیر اور بعد ازاں ملت اسلامیہ میں قبول عام حاصل کر گئی۔ یہ بھی علامہ اقبال کا امتیاز ہے کہ ان کی فکر ان کی زندگی میں ہی حقیقت کا روپ دھارنا شروع ہو گئی تھی حتی کہ جن تصورات کی طرف علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں اشارہ کیا تھا وہی تصورات

---

[۱] شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ: مجموعہ مکاتیب، مکتوب بنام مولوی ظفر احمد صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۴۔

بعد ازاں حقیقت بنے۔ انہوں نے اپنے کلام میں انہی شخصیات کو بطور نمونے کے پیش کیا جن میں فقر کا کوئی نہ کوئی وصف، پہلو یا خصوصیت موجود تھی تاریخ اسلام کو وہ شخصیات جو فقر سے کلیتاً دور تھیں انہیں علامہ نے بطور آئیڈیل کے پیش نہیں کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی اس فقر کا کامل نمونہ ہے جس پر آپ نے فخر کا اظہار فرمایا۔

اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دولت کی خواہش ہوتی تو اللہ تعالیٰ جبل احد کو بھی سونا بنا دیتا۔ حد یہ ہے کہ جب مدینہ منورہ کے گلی کوچوں میں مال غنیمت کے ڈھیر لگ گئے اور ہر چیز کی افراط تھی، تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی شے کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اور نہ اسباب دنیوی کو اہمیت دی۔ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد نبوی کی چٹائی پر سوئے ہوئے تھے اور چٹائی جسد مبارک پر جا بجا کھب گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور چٹائی کے نشان دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دریافت فرمایا: اے عمر! روتے کیوں ہو؟ فرمایا: حضور پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ قیصر و کسریٰ جیسے کافر اور فاسق و فاجر لوگ تو عالیشان محلات میں ریشم و کمخواب کے بستر پر سوئیں اور حضرت رحمۃ للعالمین ہو کر بھی چٹائی کے اس تکلیف دہ فرش پر۔ یہی چیز مجھے رونے پر مجبور کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

أَمَا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْآخِرَةُ[1]

عمر! ان کا عیش و آرام بالکل عارضی اور وقتی ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ دار بقا میں دائمی اور ابدی نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔ ہم دائمی کو چھوڑ کر عارضی چیز میں کیوں محو ہوں، اور خسارے کا سودا کیوں کریں۔

بہر حال اس فقر کی شان یہ تھی کہ اپنے سامنے زر و سیم کے انبار دیکھ کر بھی فقر ہی رہا اور دنیوی جاہ و حشم کے متعلق حرص و آز کو دل میں مطلق جگہ نہ دی۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا

---

[1] ۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجمعہ، باب من انتظر حتی تدفن، ۴: ۱۸۶۷، حدیث نمبر ۴۶۲۹۔

کہ ہم نبیوں کے گروہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہم نہ تو اپنے اجداد سے کسی قسم کی مالی وراثت پاتے ہیں اور نہ اپنی اولاد کے لیے یہ وراثت چھوڑتے ہیں۔

لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ[۱]

اسی سے ثابت ہے کہ اس "فقر" کا نصب العین سرمایہ ہرگز نہیں تھا، بلکہ تبلیغ حق اور قیام حکومت الٰہیہ اس کا واحد مطمح نظر تھا۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جو فقر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے باعث فخر تھا، وہ فقر مخلوق سے قطعی بے نیازی اور خالق کے حضور مکمل نیاز مندی کا مفہوم رکھتا ہے۔ حسب آیہ قرآنی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔[۲]

اے انسانو! تم سب کے سب اللہ کے (دروازے پر) فقیر ہو (محتاج و نیاز مند ہو) اور اللہ تو تمام مخلوق سے بے نیاز ہے۔ قابل حمد و ستائش ہے۔[۳]

علامہ اقبال جس فقر کی تعلیم دیتے ہیں اس سے مراد محض معاشی یا اقتصادی طور پر پسماندہ ہونا یا محتاجی کی حالت میں ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک فقر ایک روحانی اور اخلاقی حالت کا نام ہے، جو دنیا کے تمام تر وسائل کے باوجود ان وسائل سے مستغنی ہونے، انہیں اپنی عظمت کا معیار نہ سمجھنے اور انہیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کرنے کی کیفیت ہے۔ فقر کا یہ مفہوم دراصل ان تمام مادی لذتوں اور آسائشوں سے بے نیاز ہو کر ایک بلند مقصد کی خدمت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے کا پیغام دیتا ہے۔ اس فقر میں انسانیت کی خدمت، ایثار، استغنا، توکل اور رضا کی خصوصیات موجود ہیں۔

اس فقر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان دنیاوی وسائل اور دولت سے مکمل طور پر بے گلہ ہو جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان ان وسائل کو اپنی عزت و عظمت کا معیار نہ سمجھے، بلکہ ان وسائل کا استعمال انسانوں کی فلاح و بہبود اور معاشرتی ترقی کے لیے کرے۔

۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الفرائض، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لا نورث ما ترکنا صدقة، ۶: ۲۴۷۵، حدیث نمبر ۶۳۴۹۔

۲۔ الفاطر، ۳۵: ۱۵۔

۳۔ عبد الرحمٰن طارق بی۔ اے، اشارات اقبال، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۹۰ – ۹۱۔

علامہ اقبال کے نزدیک فقر انسان کی اندرونی قوت اور عزم کی عکاسی کرتا ہے، جہاں انسان کا دل دنیاوی لذتوں سے آزاد ہو اور اس کا رشتہ اللہ کی رضا اور انسانیت کی خدمت سے ہو۔

جب علامہ اقبال نے مسلمان کے زوال کے اسباب بیان کیے، تو انہوں نے اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ مسلمانوں کا فکری و روحانی زوال اس وقت شروع ہوا جب انہوں نے دنیا کے وسائل کو اپنی عظمت کا معیار سمجھنا شروع کیا۔ وہ اپنی مادیت میں اتنے غرق ہو گئے کہ انہوں نے اپنے روحانی مقاصد اور بلند اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیا۔ اقبال نے فرمایا کہ مسلمان کا اصل فقر وہ ہے جو انسان کو اپنے اندر کی حقیقت اور روحانی مقصد تک پہنچنے میں مدد دے، اور یہی فقر انسان کو اپنی تقدیر کا معمار اور اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق استوار کرنے کے قابل بناتا ہے۔

علامہ اقبال کے فلسفہ میں فقر ایک ایسی حالت ہے جو انسان کو دنیا کے فریب سے آزاد کر کے اسے حقیقی سکون اور کامیابی کی جانب رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ فقر کا یہ مفہوم انسان کے روحانی اور اخلاقی ارتقاء کا ذریعہ ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے اندر کی کمزوریوں کو دور کر کے ایک مضبوط اور کامیاب شخصیت کی تشکیل کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر، تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے، تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں[1]

---

[1] ۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۸ء، ص ۵۳۲۔

۶۔ بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبارا

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی عظمت اور ان کے کردار کی بے مثل خصوصیت کو بیان کرنے کے لیے حافظ شیرازی کے ایک مشہور مصرعے کا سہارا لیا ہے۔ اس مصرعے کے ذریعے علامہ اقبال اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ ہمارے اجداد، جن میں سرفہرست خلفائے راشدین ہیں، حکمران ہونے کے باوجود دنیاوی رعب و دبدبہ، سطوت و تمکنت یا رعب و جلال کے محتاج نہ تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی عظمت اور کردار کی بلندی اس قدر تھی کہ دنیاوی مراتب اور منصب ان کے لیے وقار کا معیار نہ تھے۔ اس کے بجائے، ان کی ہستیاں خود اتنی بلند اور عظیم تھیں کہ دنیاوی منصب اور مرتبے ان کے احترام اور عظمت کو مزید بڑھانے کے بجائے، ان کے لیے صرف ایک ذمہ داری بن کر رہ گئے تھے۔

خلفائے راشدین اور دیگر عظیم شخصیات نے ثابت کیا کہ ان کی عظمت ان کے کردار اور اخلاقیات میں تھی، نہ کہ ان کے عہدوں یا دنیاوی حکومتی طاقت میں۔ وہ اس قدر بلند شخصیت کے حامل تھے کہ ان کی خودی، علم، اور دیانت داری نے انہیں حکمرانی کے دوران عوام میں عزت و احترام بخشا۔ اس کے برخلاف، ان کے عہدوں اور سلطنتوں نے انہیں مزید جلال و عظمت عطا نہیں کی، بلکہ ان کے کردار نے دنیاوی حکومتی طاقت کو وقار عطا کیا۔

یہ سراپا فقر ہونے کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خلفائے راشدین اور ان کے ہم عصر رہنما دنیاوی منصبوں کے محتاج نہیں تھے۔ ان کی عظمت اور روحانی قوت اس قدر مضبوط تھی کہ وہ کسی بھی دنیاوی سہارے یا عہدے کے محتاج نہیں تھے تاکہ ان کے کردار کی عظمت کا اعتراف کیا جاسکے۔ ان کا فقر دراصل دنیا کی فانی لذتوں سے بے پرواہ ہونا تھا، جس کے ذریعے انہوں نے اپنی زندگی کو اللہ کی رضا، انصاف، اور معاشرتی فلاح کے لیے وقف کر دیا۔ یہ وہ عظمت تھی جو ان کے کردار کی بدولت پیدا ہوئی، اور یہ حقیقت اسلام کی اصل روح کی عکاسی کرتی ہے کہ حقیقی عظمت دنیاوی منصبوں میں نہیں، بلکہ کردار کی بلندی اور روحانیت میں ہوتی ہے۔

علامہ اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے اندر کی حقیقت کو پہچان کر اپنی خودی کو بلند کرتا ہے، تب تک وہ دنیا کے کسی بھی عہدے یا مرتبے کا محتاج نہیں رہتا۔

وہ خود اپنے اندر اتنی عظمت پیدا کرتا ہے کہ وہ کسی بھی دنیاوی رعب و دبدبے سے آزاد ہو کر اپنے مشن اور مقصد کی تکمیل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ حافظ شیرازی کا شعر یوں ہے:

ز عشق ناتمام ما جمال یار مُستَغنی است
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روی زیبارا؟[1]

''ہمارے ناتمام عشق سے جمال یار بے پرواہ ہے۔ آب و رنگ اور خال و خط کی روئے زیبا کو ضرورت نہیں۔''

میر ولی اللہ اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں:

''قدرتی حسن کے لیے مصنوعی سنگار کی ضرورت نہیں۔ اور نہ معشوق کو ہمارے نامکمل عشق کی پرواہ ہے۔ اس کا حسن ان تمام لوازمات سے بے پرواہ ہے ہم اسے چاہیں یا نہ۔ اس کے عاشق ہوں یا نہ ہوں۔ اس کے حسن کامل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ وَمَن كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِين۔[2] ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ وَاِن تَكْفُرُوا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ غنيًّا حَمِيدًا[3]۔

مولانا روم فرماتے ہیں:

ذکر جسمانہ خیال ناقصست
وصف شاہانہ از آنہا خالصست[4]

.....

حمد تو نسبت بداں گر بہترست
لیک آں نسبت بحق ہم ابترست[5]

---

[1] حافظ شیرازی، خواجہ شمس الدین محمد، دیوان حافظ، بہ تصحیح و توضیح پرویز ناتل خانلری، تہران، چاپ اول، ۱۳۶۲ھ۔ ش، غزل نمبر ۳، ص ۲۲۔

[2] آل عمران، ۳: ۹۷۔

[3] النساء، ۴: ۱۳۱۔

[4] مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر دوم، بخش ۳۴، بیت ۸۵۔

[5] مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر دوم، بخش ۳۷، بیت ۲۴۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حسن مطلق پر دلدادہ نہ ہو تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ جو چیز بذاتہ مکمل ہو اسے تصنع کی ضرورت نہیں۔ اس لیے ہم اگر اپنے معبود کی پرستش کرتے ہیں تو صرف اپنے فائدہ کے لیے۔ محبوب کو اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ اور اگر ہم اپنی معبود کی پرستش نہ کریں تو اس کو کچھ نقصان نہیں۔ سورہ عنکبوت میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے: وَمَن جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ اِنَّ اللہ لَغَنِی عَنِ العَالمین[۱]۔

خدا در انتظار حمد ما نیست
محمد چشم بر راہ ثنا نیست[۲]

غلام رسول مہر اپنی تصنیف "مطالب بانگ درا" میں لکھتے ہیں:

سچ کہا حافظ نے کہ چہرہ حسین اور خوبصورت ہو تو وہ بناوٹی زیب و زینت اور سجاوٹ سے بے نیاز ہوتا ہے۔ خواجہ حافظ نے چار لفظ استعمال کیے۔ آب و رنگ و خال و خط۔ آب سے مراد ہے چہرہ خوب دھو کر صاف کرنا۔ رنگ سے مراد ہے غازہ اور سرخی، خال سے مراد ہے چہرے پر تل بنانا، خط سے مراد ابرو کے مقام پر سیاہ لکیر کھینچنا ہے۔ یہ سب بناوٹ کی چیزیں ہیں۔ ذاتی حسن بناوٹ سے بے پرواہ ہوتا ہے۔[۳]

علامہ اقبال یہاں یہ فرمارہے ہیں کہ اے نوجواں مسلم! تیرے اجداد بناوٹی حسن کے محتاج نہ تھے۔ وہ احکام خداوند کی پابندی اور اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کی وجہ سے کردار کی اس بلندی پر فائز تھے کہ وہ خود دنیا کے بناوٹی حسن کو حقیقت میں بدلنے کا منہج دینے والے تھے۔

۱۔ العنکبوت، ۲۹: ۶۔

۲۔ میر ولی اللہ، لسان الغیب یعنی اردو شرح دیوان حافظ مع مفصل سوانح عمری خاجہ حافظ، نول کشور پریس، بار سوم، ۱۹۲۳ء، ص ۵۷ – ۵۸۔ غلام رسول مہر، مطالب بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۳۰۰۔

۳۔ غلام رسول مہر، مطالب بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۳۰۰۔

(۵)

جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

۷۔ جہاں گیری و جہاں داری

علامہ اقبال یہاں مسلم نوجوانوں کو اپنی تاریخ سے آگاہ ہونے کا درس دیتے ہیں اور ان میں یہ شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان صرف اپنے وقت کے عظیم فاتحین نہیں تھے بلکہ ان کی فتوحات کا مقصد محض سرحدوں کی توسیع یا دنیا پر حکمرانی نہیں تھا۔ ان فتوحات کی اصل حقیقت یہ تھی کہ مسلمان ایک ایسی تہذیب اور علم و حکمت کے حامل تھے جسے دنیا کے مختلف حصوں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات صرف فوجی کارروائیوں اور سلطنتوں کے قیام تک محدود نہیں تھیں، بلکہ یہ ایک عظیم مقصد کے تحت انجام دی گئیں، جو دنیا کو اعلیٰ تہذیبی اقدار، اخلاقی اصولوں اور روحانی روشنی سے آگاہ کرنے کی مہم تھی۔

مسلمانوں نے جب اپنے فتوحات کا آغاز کیا، تو انہوں نے نہ صرف زمینوں کو فتح کیا بلکہ انسانیت کے لیے ایک نیا معیار بھی قائم کیا۔ ان کی فتوحات کے پیچھے ایک بلند نظریہ تھا، جس کے تحت انہوں نے دنیا کو عدل، مساوات، تعلیم اور علم کی روشنی سے منور کیا۔ مسلمانوں نے اپنے فلسفہ، سائنس، ادب اور فنون کے ذریعے مختلف تہذیبوں کو متاثر کیا اور ان کے ساتھ علم و حکمت کا تبادلہ کیا۔ یہ فتوحات ایک بلند مقصد کی تکمیل تھیں، جہاں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں اعلیٰ تہذیبی اقدار متعارف کرائیں، جن میں انسانیت کی فلاح و بہبود، برابری، عدل، اور بھائی چارے کے اصول شامل تھے۔

علامہ اقبال مسلم نوجوانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ مسلمانوں کی اصل عظمت ان کی فتوحات کی نوعیت میں تھی، جو صرف مادی یا سیاسی فتح تک محدود نہیں تھی بلکہ ایک بلند روحانی اور ثقافتی فتح تھی۔ ان کا پیغام یہ تھا کہ مسلمان نہ صرف دنیا کو فتح کرنے والے تھے بلکہ وہ اس دنیا میں اعلیٰ اخلاقی اصولوں اور تہذیبی قدروں کا پرچار کرنے والے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے سیکھنا اور ان اقدار کو اپنانا ضروری ہے تاکہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے کردار اور علم کی روشنی سے دنیا میں انقلاب لا سکیں۔

علامہ اقبال کی اس تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ مسلم نوجوان اپنی تاریخ کو سمجھیں اور اس سے وہ بلند فکری اور اخلاقی اقدار حاصل کریں جو مسلمانوں کے عروج کی وجہ تھیں۔ وہ انہیں اس بات کا شعور دیتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر ان اقدار کو زندہ کر کے دنیا میں اسلام کی حقیقی اور مکمل تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ مورخین نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان سے علامہ اقبال کے اس موقف کی تائید ہوتی ہے:

رومی فوجیں بیسان میں جمع ہوئیں اور مسلمانوں نے ان کے سامنے فحل میں پڑاؤ ڈالا۔ رومیوں نے اس ڈر سے کہ مسلمان دفعتاً نہ آ پڑیں۔ آس پاس جس قدر نہریں تھیں سب کے بند توڑ دیے اور فحل سے بیسان تک تمام عالم آب ہو گیا۔ کیچڑ اور پانی کی وجہ سے تمام راستے رک گئے لیکن اسلام کا سیلاب کب رک سکتا تھا۔ مسلمانوں کا استقلال دیکھ کر عیسائی صلح پر آمادہ ہوئے۔ اور ابوعبیدہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ کوئی شخص سفیر بن کر آئے۔ ابوعبیدہؓ نے معاذ بن جبلؓ کو بھیجا۔ معاذ رومیوں کے لشکر میں پہنچے تو دیکھا کہ خیمے میں دیبائے زریں کا فرش بچھا ہے، وہیں ٹھہر گئے۔ ایک عیسائی نے آ کر کہا کہ میں گھوڑا تھام لیتا ہوں، آپ دربار میں جا کر بیٹھیے۔ معاذؓ کی بزرگی اور تقدس کا عام چرچا تھا اور عیسائی تک اس سے واقف تھے۔ اس لیے وہ واقعی ان کی عزت کرنا چاہتے تھے اور ان کا باہر کھڑا رہنا ان کو گراں گزرتا تھا۔ معاذؓ نے کہا میں اس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر تیار ہوا ہے، بیٹھنا نہیں چاہتا۔ یہ کہہ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ عیسائیوں نے افسوس کیا اور کہا کہ ہم تمہاری عزت کرنا چاہتے تھے لیکن تم کو خود اپنی عزت کا خیال نہیں تو مجبوری ہے۔ معاذؓ کو غصہ آیا گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے اور کہا کہ جس کو تم عزت سمجھتے ہو مجھے اس کی پرواہ نہیں اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا

شیوہ ہے تو مجھ سے بڑھ کر کون اللہ کا غلام ہو سکتا ہے؟ رومی ان کی بے پروائی اور آزادی پر حیرت زدہ تھے، یہاں تک کہ ایک شخص نے پوچھا کہ مسلمانوں میں تم سے کوئی بڑھ کر بھی ہے؟ انہوں نے کہا معاذ اللہ یہی بہت ہے کہ میں سب سے بدتر ہوں۔ رومی چپ ہو گئے۔ معاذؓ نے کچھ دیر تک انتظار کیا اور مترجم سے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر تم کو مجھ سے کچھ کہنا نہیں ہے تو میں واپس جاتا ہوں۔ رومیوں نے کہا ہم کو یہ پوچھنا ہے کہ تم اس طرف کس غرض سے آئے ہو۔ ابی سینا کا ملک تم سے قریب ہے۔ فارس کا بادشاہ مر چکا ہے اور سلطنت ایک عورت کے ہاتھ میں ہے، ان کو چھوڑ کر تم نے ہماری طرف کیوں رخ کیا؟ حالانکہ ہمارا بادشاہ سب سے بڑا بادشاہ ہے اور تعداد میں ہم آسمان کے ستاروں اور زمین کے ذروں کے برابر ہیں۔ معاذؓ نے کہا سب سے پہلے یہ ہماری درخواست ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھو، شراب پینا چھوڑ دو، سور کا گوشت نہ کھاؤ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمہارے بھائی ہیں اگر اسلام لانا منظور نہیں ہے تو جزیہ دو۔ اس سے بھی انکار ہو تو آگے تلوار ہے۔ اگر تم آسمان کے ستاروں کے برابر ہو تو ہم کو قلت اور کثرت کی پراوہ نہیں ہمارے اللہ نے کہا ہے:

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ[1]

کئی مرتبہ اللہ کے حکم سے تھوڑی سی جماعت (خاصی) بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔

تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر وہ زنا کرے تو اس کو درے لگائے جائیں، چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں، وہ پردے میں نہیں بیٹھتا، اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا، مال و دولت میں اس کو ہم پر کوئی ترجیح نہیں۔ رومیوں نے کہا اچھا ہم تم کو بلقا کا ضلع اور اردن کا وہ حصہ جو تمہاری زمین سے متصل ہے، دیتے ہیں تم یہ ملک چھوڑ کر فارس جاؤ۔ معاذؓ نے انکار کیا اور کہا کہ اگر ہم سارا کچھ بھی دے تب بھی ہم واپس نہیں جائیں گے اور تم کو ہماری تین شرائط میں ایک ماننا پڑے گے۔ جس پر انہوں نے جنگ اختیار کرنے کی دھمکی دی۔ حضرت معاذ نے فرمایا:

---

[1] البقرۃ، ۲: ۲۴۹۔

واللہ لنقتلنا عن اخرنا او لنخرجنکم من ارضکم اذلة و انتم صاغرون[1]
بخدا! ہم آخری دم تک لڑیں گے یا تمہیں ضرور بضرور تمہاری سرزمین سے ذلیل کر کے نکال دیں اور تم رسوا ہو جاؤ گے۔

یہ کہہ کر معاذ وہاں سے چلے آئے۔ رومیوں نے براہ راست ابوعبیدہؓ سے گفتگو کرنی چاہی۔ چنانچہ اس غرض سے ایک قاصد بھیجا جس وقت وہ پہنچا ابوعبیدہؓ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہاتھ میں تیر تھے جن کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ قاصد نے خیال کیا کہ سپہ سالار بڑا جاہ و حشم رکھتا ہو گا اور یہی اس کی شناخت کا ذریعہ ہو گا لیکن وہ جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا تھا سب ایک رنگ میں ڈوبے نظر آتے تھے۔ آخر گھبرا کر پوچھا کہ تمہارا سردار کون ہے؟ لوگوں نے ابوعبیدہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ حیران رہ گیا اور تعجب سے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ کیا در حقیقت تم ہی سردار ہو؟ ابوعبیدہؓ نے کہا: ہاں۔ قاصد نے کہا: ہم تمہاری فوج کو فی کس دو دو اشرفیاں دیں گے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ابوعبیدہؓ نے انکار کیا تو برہم ہو کر اٹھا۔ ابوعبیدہؓ نے اس کے تیور دیکھ کر فوج کو کمر بندی کا حکم دیا اور تمام حالات حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجے۔ حضرت عمرؓ نے جواب مناسب لکھا اور حوصلہ دیا کہ ثابت قدم رہو اللہ تمہارا یاور اور مددگار ہے۔ حضرت عمر کے پاس خط لانے والا قاصد نصرانی تھا جسے حضرت عمر نے اسلام قبول کرنے کی ترغیب دلائی تو وہ مسلمان ہو گیا۔ ابو اسماعیل محمد بن عبد اللہ الازدی نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ نصرانی قاصد کے اسلام قبول کرنے پر حضرت عمر نے فرمایا:

الحمد للہ الذی یھدی من یشاء اذا شاء الی الاسلام و یجعل معرفة الاسلام فی قلوبھم[2]

ابوعبیدہؓ نے اسی دن کمر بندی کا حکم دے دیا تھا لیکن رومی مقابلے میں نہ آئے۔ اگلے دن تنہا خالدؓ میدان میں گئے۔ صرف سواروں کا ایک رسالہ رکاب میں تھا۔ رومیوں نے بھی جنگ کی تیاری کی اور فوج کے تین حصے کر کے باری باری میدان میں بھیجے۔ پہلا دستہ خالدؓ کی طرف باگیں اٹھائے چلا آ رہا تھا کہ خالدؓ کے اشارے سے قیس بن ہبیرہ نے صف سے نکل کر ان کا آگا روکا اور سخت کشت و خون ہوا۔ یہ معرکہ ابھی سر نہیں ہوا تھا کہ دوسری فوج نکلی۔ خالدؓ

---

[1] ۔ ازدی، فتوح الشام، ص ۱۰۷۔
[2] ۔ ازدی، فتوح الشام، ص ۱۱۱۔

نے مسیرہ بن مسروق کو اشارہ کیا وہ اپنی رکاب کی فوج لے کر مقابل ہوئے۔ تیسرا لشکر بڑے سروسامان سے نکلا۔ ایک مشہور سپہ سالار تھا اور بڑی تدبیر سے فوج کو بڑھاتا آتا تھا۔ قریب پہنچ کر خود ٹھہر گیا اور ایک افسر کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ خالدؓ کے مقابلے کو بھیجا۔ خالدؓ نے بھی یہ حملہ نہایت استقلال سے سنبھالا۔ آخر سپہ سالار نے خود حملہ کیا اور پہلی دونوں فوجیں بھی آکر مل گئیں۔ دیر تک معرکہ رہا۔ مسلمانوں کی ثابت قدمی دیکھ کر رومیوں نے زیادہ لڑنا بیکار سمجھا اور الٹا واپس جانا چاہا۔ خالدؓ نے ساتھیوں کو للکارا کہ رومی اپنا زور صرف کر چکے اب ہماری باری ہے۔ اس صدا کے ساتھ مسلمان دفعتاً ٹوٹ پڑے اور رومیوں کو برابر د باتے چلے گئے۔

عیسائی مدد کے انتظار میں لڑائی ٹالتے جارہے تھے۔ خالدؓ ان کی یہ چال سمجھ گئے اور ابوعبیدہؓ سے کہا کہ رومی ہم سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ حملے کا یہی وقت ہے چنانچہ اسی وقت نقیب فوج میں جا کر پکار آئے کہ حملہ کل ہو گا۔ فوج سروسامان سے تیار رہے۔ رات کے پچھلے پہر ابوعبیدہؓ بستر خواب سے اٹھے اور فوج کی ترتیب شروع کی۔ معاذ بن جبلؓ کو میمنہ پر مقرر کیا، ہاشم بن عتبہ کو میسرہ کی افسری دی، پیدل فوج پر سعید بن زید متعین ہوئے، سوار خالدؓ کی ماتحتی میں دیے گئے۔ فوج آراستہ ہو چکی تو ابوعبیدہؓ نے اس سرے سے اس سرے تک ایک چکر لگایا۔ ایک ایک علم کے پاس جا کر کھڑے ہوتے تھے اور کہتے تھے:

عباد الله استوجبوا من الله النصر بالصبر فإن الله مع الصابرين[1]

"اللہ سے مدد چاہتے ہو تو ثابت قدم رہو کیونکہ اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے"۔

رومیوں نے جو تقریباً پچاس ہزار تھے، آگے پیچھے پانچ صفیں قائم کیں جن کی ترتیب یہ تھی کہ پہلی صف میں ہر ہر سوار کے دائیں بائیں دو دو قدر انداز میمنہ اور میسرہ پر سواروں کے رسالے نیچے پیادہ فوجیں۔ اس ترتیب سے نقارہ دمامہ بجاتے ہوئے مسلمانوں کی طرف بڑھے۔ خالدؓ چونکہ ہراول پر تھے، پہلے انہی سے مقابلہ ہوا۔ رومی قدر اندازوں نے تیروں کا اس قدر مینہ برسایا کہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ خالدؓ ادھر سے پہلو دے کر میمنہ کی طرف جھکے کیونکہ اس میں سوار ہی سوار تھے، قدر انداز نہ تھے۔ رومیوں کے حوصلے اس قدر بڑھ

---

[1] کلاعی، الاکتفابما تضمن من مغازی رسول اللہ، عالم الکتب، بیروت، ۱۴۱۷ھ، ۳: ۲۰۱۔

گئے تھے کہ میمنہ کا رسالہ فوج سے الگ ہو کر خالدؓ پر حملہ آور ہوا۔ خالدؓ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے جاتے تھے یہاں تک کہ رسالہ فوج سے دور نکل آیا۔ خالدؓ نے موقع پا کر اس زور شور سے حملہ کیا کہ صفیں کی صفیں الٹ دیں۔ گیارہ بڑے بڑے افسر ان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ادھر قیس بن ہبیرہ نے میسرہ پر حملہ کر کے رومیوں کا دوسرا بازو بھی کمزور کر دیا۔ تاہم قلب کی فوج تیر اندازوں کی وجہ سے محفوظ تھی۔ ہاشم بن عتبہؓ نے جو میسرہ کے سردار تھے، علم ہلا کر کہا: اللہ کی قسم! جب تک اس کو قلب میں پہنچ کر نہ گاڑ دوں گا پھر کر نہ آؤں گا۔ یہ کہہ کر گھوڑے سے کود پڑے اور ہاتھ میں سپر لے کر لڑتے بھڑتے اس قدر قریب پہنچ گئے کہ تیر و خدنگ سے گزر کر تیغ و شمشیر کی نوبت آئی۔ کامل گھنٹہ بھر لڑائی رہی اور تمام میدان خون سے رنگین ہو گیا۔ آخر رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور نہایت بدحواسی سے بھاگے۔ ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو فتح نامہ لکھا اور پوچھا کہ مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ حضرت عمر نے جواب میں لکھا کہ رعایا ذمی قرار دی جائے اور زمین بدستور زمینداروں کے قبضے میں چھوڑ دی جائے۔[1] حضرت عمر نے مسلمانوں کو مفتوحین پر ظلم کرنے اور ان کا مال ناحق ہتھیانے سے منع فرمایا۔ حضرت عمر کی رائے پر عمل کیا گیا۔ ازدی لکھتے ہیں:

فلما جاء ابا عبیده بن الجراح هذا الرای من عمر رضی الله عنه عمل به وکان رایه و رای عمر فی هذا واحداً[2]

جب ابوعبیدہ کے پاس حضرت عمر کی یہ رائے آگئی تو اس پر عمل کیا گیا اور حضرت ابوعبیدہ اور حضرت عمر کی اس معاملے میں رائے یکساں تھی۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے جو مقامات فتح کر لیے تھے وہاں کے امراء اور رئیس ان کے عدل و انصاف کے اس قدر گرویدہ ہو گئے تھے کہ باوجود تخالف مذہب کے خود اپنی طرف سے دشمن کی خبر لانے کے لیے جاسوس مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ ان کے ذریعے سے حضرت ابوعبیدہؓ کو تمام واقعات کی اطلاع ہوئی۔ انہوں نے تمام افسروں کو جمع کیا اور کھڑے ہو کر ایک پر اثر تقریر کی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانو! اللہ نے تم کو بار بار جانچا اور تم اس کی

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۱۹۲ تا ۱۹۸

[2] ۔ الازدی، فتوح الشام، ص ۱۲۴ – ۱۲۵۔

جانچ میں پورے اترے۔ چنانچہ اس کے صلے میں اللہ نے ہمیشہ تم کو مظفر و منصور رکھا۔ اب تمہارا دشمن اس سروسامان سے تمہارے مقابلے کے لیے چلا ہے کہ زمین کانپ اٹھی ہے۔ اب بتاؤ کیا صلاح ہے؟ یزید بن ابی سفیانؓ (معاویہؓ کے بھائی) کھڑے ہوئے اور کہا کہ میری رائے ہے کہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں رہنے دیں اور ہم خود شہر کے باہر لشکر آراء ہوں۔ اس کے ساتھ خالدؓ اور عمرو بن العاصؓ کو خط لکھا جائے کہ دمشق اور فلسطین سے چل کر مدد کو آئیں۔ شرجیل بن حسنہ نے کہا کہ اس موقع پر ہر شخص کو آزادانہ رائے دینی چاہیے۔ یزید نے جو رائے دی بلاشبہ خیر خواہی سے دی ہے لیکن میں اس کا مخالف ہوں۔ شہر والے تمام عیسائی ہیں ممکن ہے کہ وہ تعصب سے ہمارے اہل و عیال کو پکڑ کر قیصر کے حوالے کر دیں یا خود مار ڈالیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا اس کی تدبیر یہ ہے کہ ہم عیسائیوں کو شہر سے نکال دیں۔ شرجیل نے اٹھ کر کہا اے امیر! تجھ کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں۔ ہم نے ان عیسائیوں کو اس شرط پر امن دیا ہے کہ وہ شہر میں اطمینان سے رہیں، اس لیے نقض عہد کیونکر ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنی غلطی تسلیم کی لیکن یہ بحث طے نہ ہوئی کہ آخر کیا کیا جائے؟ عام حاضرین نے رائے دی کہ حمص میں ٹھہر کر امدادی فوج کا انتظار کیا جائے۔ ابوعبیدہؓ نے کہا: اتنا وقت کہاں ہے؟ آخر یہ رائے ٹھہری کہ حمص چھوڑ کر دمشق روانہ ہوں۔ وہاں خالد موجود ہیں اور عرب کی سرحد قریب ہے۔ یہ ارادہ مصمم ہو چکا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے حبیب بن سلمہ کو جو افسر خزانہ تھے، بلا کر کہا کہ عیسائیوں سے جو جزیہ یا خراج لیا جاتا ہے اس معاوضہ میں لیا جاتا ہے کہ ہم ان کو دشمنوں سے بچا سکیں۔ لیکن اس وقت ہماری حالت ایسی نازک ہے کہ ہم ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے جو کچھ ان سے وصول ہوا ہے، سب ان کو واپس دے دو اور ان سے کہہ دو کہ ہم کو تمہارے ساتھ جو تعلق تھا اب بھی ہے لیکن چونکہ اس وقت ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے اس لیے جزیہ جو حفاظت کا معاوضہ ہے تم کو واپس کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول ہوئی تھی، تمام واپس کر دی گئی۔ عیسائیوں کو اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ اللہ تم کو واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے

کہا تورات کی قسم! جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے اور ہر جگہ چوکی پہرہ بٹھا دیا۔[1]

مقدادؓ جو نہایت خوش آواز تھے، فوج کے آگے آگے سورہ انفال (جس میں جہاد کی ترغیب ہے) تلاوت کرتے جاتے تھے۔

ادھر رومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں بیڑیاں پہن لیں کہ ہٹنے کا خیال تک نہ آئے۔ جنگ کی ابتداء رومیوں کی طرف سے ہوئی۔ دو لاکھ کاٹڈی دل لشکر ایک ساتھ بڑھا۔ ہزاروں پادری اور بشپ ہاتھوں میں صلیب لئے آگے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کی جے پکارتے آتے تھے۔ یہ سروسامان دیکھ کر ایک شخص کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ اللہ اکبر! کس قدر بے انتہا فوج ہے۔ خالدؓ نے جھلا کر کہا چپ رہ، اللہ کی قسم! میرے گھوڑے کے سم اچھے ہوتے تو میں کہہ دیتا کہ عیسائی اتنی ہی اور فوج بڑھا لیں۔

غرض عیسائیوں نے نہایت زور و شور سے حملہ کیا اور تیروں کا مینہ برساتے بڑھے۔ مسلمان دیر تک ثابت قدم رہے لیکن حملہ اس زور کا تھا کہ مسلمانوں کا میمنہ ٹوٹ کر فوج سے علیحدہ ہو گیا اور نہایت بے ترتیبی سے پیچھے ہٹا۔ ہزیمت یافتہ ہٹتے ہٹتے حرم کے خیمہ گاہ تک آ گئے۔ عورتوں کو یہ حالت دیکھ کر سخت غصہ آیا اور خیمہ کی چوبیں اکھاڑ لیں اور پکاریں کہ "نامردو! ادھر آئے تو چوبوں سے تمہارا سر توڑ دیں گے۔" خولہؓ یہ شعر پڑھ کر لوگوں کو غیرت دلاتی تھیں۔

يا هاربا عن نسوة ثقات
لها جمال ولها ثبات
تسلموهن إلى الهنات
تملك نواصينا مع البنات
أعلاج سوق فسق عتاة
ينلن منا أعظم الشتات [2]

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۲۰۲ تا ۲۰۴

[2] الواقدی، فتوح الشام، ۱: ۲۰۶

یہ حالت دیکھ کر معاذ بن جبلؓ جو میمنہ کے ایک حصے کے سپہ سالار تھے، گھوڑے سے کود پڑے، اور کہا کہ ''میں تو پیدل لڑتا ہوں لیکن کوئی بہادر اس گھوڑے کا حق ادا کر سکے تو گھوڑا حاضر ہے۔'' ان کے بیٹے نے کہا: ہاں، یہ حق میں ادا کروں گا کیونکہ میں سوار ہو کر اچھا لڑ سکتا ہوں۔ غرض دونوں باپ بیٹے فوج میں گھسے اور اس دلیری سے جنگ کی کہ مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے پاؤں پھر سنبھل گئے۔ ساتھ ہی حجاج جو قبیلہ زبیدہ کے سردار تھے، پانچ سو آدمی لے کر بڑھے اور عیسائیوں کا جو مسلمانوں کا تعاقب کرتے چلے آتے تھے، آگا روک لیا۔ میمنہ میں قبیلہ ازد شروع حملہ سے ثابت قدم رہا تھا۔ عیسائیوں نے لڑائی کا سارا زور ان پر ڈالا لیکن وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ جنگ کی یہ شدت تھی کہ فوج میں ہر طرف سر، ہاتھ، بازو، کٹ کٹ کر گرتے جاتے تھے لیکن ان کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی تھی۔ عمرو بن طفیل جو قبیلہ کے سردار تھے، تلوار مارتے جاتے تھے اور للکارتے جاتے تھے کہ از دیو! دیکھنا مسلمانوں پر تمہاری وجہ سے داغ نہ آئے۔ نو بڑے بڑے بہادر ان کے ہاتھ سے مارے گئے اور آخر خود شہادت حاصل کی۔

حضرت خالدؓ نے اپنی فوج کو پیچھے لگا رکھا تھا۔ دفعتاً صف چیر کر نکلے اور اس زور سے حملہ کیا کہ رومیوں کی صفیں ابتر کر دیں۔ عکرمہؓ نے جو ابو جہل کے فرزند تھے اور اسلام لانے سے پہلے اکثر کفار کے ساتھ رہ کر لڑے تھے، گھوڑا آگے بڑھایا اور کہا عیسائیو! میں کسی زمانے میں (کفر کی حالت میں) خود رسول اللہ ﷺ سے لڑ چکا ہوں۔ کیا آج تمہارے مقابلے میں میرا پاؤں پیچھے پڑ سکتا ہے؟ یہ کہہ کر فوج کی طرف دیکھا اور کہا مرنے پر کون بیعت کرتا ہے؟ چار سو شخصوں نے جن میں ضرار بن ازور بھی تھے، مرنے پر بیعت کی اور اس ثابت قدمی سے لڑے کہ قریباً سب کے سب وہیں کٹ کر رہ گئے۔ عکرمہؓ کی لاش مقتولوں کے ڈھیر میں ملی۔ کچھ کچھ دم باقی تھا۔ خالدؓ نے اپنے زانو پر ان کا سر رکھا اور گلے میں پانی ٹپکا کر کہا

كلا زعم ابن الحنتمة أنا لا نستشهد[1]

ابن حنتمہ کا گمان غلط تھا کہ ہم شہید ہو کر نہ مریں گے۔

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک، ۲: ۳۳۸

غرض عکرمہؓ اور ان کے ساتھی گو خود ہلاک ہو گئے لیکن رومیوں کے ہزاروں آدمی برباد کر دیئے۔ خالدؓ کے حملوں نے اور بھی ان کی طاقت توڑ دی۔ یہاں تک کہ آخر ان کو پیچھے ہٹنا پڑا اور خالدؓ ان کو دباتے ہوئے سپہ سالار درنجار تک پہنچ گئے۔ درنجار اور رومی افسروں نے آنکھوں پر رومال ڈال لئے کہ اگر یہ آنکھیں فتح کی صورت نہ دیکھ سکیں تو شکست بھی نہ دیکھیں۔

عین اس وقت جب ادھر میمنہ میں بازار قتال گرم تھا۔ ابن قناطر (جو رومیوں کے میمنہ کا سپہ سالار تھا) نے میسرہ پر حملہ کیا۔ بد قسمتی سے اس حصے میں اکثر لخم وغسان کے قبیلہ کے آدمی تھے جو شام کے اطراف میں بود و باش رکھتے تھے اور ایک مدت سے روم کے باجگزار رہتے آئے تھے، رومیوں کا رعب جو دلوں میں سمایا ہوا تھا، اس کا یہ اثر ہوا کہ پہلے ہی حملے میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور اگر افسروں نے بھی بے ہمتی کی ہوتی تو لڑائی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ رومی بھاگتوں کا پیچھا کرتے ہوئے خیموں تک پہنچ گئے۔ عورتیں یہ حالت دیکھ کر بے اختیار نکل پڑیں اور ان کی پامردی نے عیسائیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ فوج اگرچہ ابتر ہو گئی تھی لیکن افسروں میں سے قباث بن اشیم، سعید بن زید، یزید بن ابی سفیان، عمرو بن العاص، شرجیل بن حسنہؓ داد شجاعت دے رہے تھے۔ قباث کے ہاتھ سے تلواریں اور نیزے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے جاتے تھے مگر ان کے تیور پر بل نہ آتا تھا۔ نیزہ ٹوٹ کر گرتا تو کہتے کہ کوئی ہے جو اس شخص کو ہتھیار دے جس نے اللہ سے اقرار کیا ہے کہ میدان جنگ سے ہٹے گا تو مر کر ہٹے گا۔ لوگ فوراً تلوار یا نیزہ ان کے ہاتھ میں لا کر دے دیتے اور پھر وہ شیر کی طرح جھپٹ کر دشمن پر جا پڑتے۔ ابو الاعور گھوڑے سے کود پڑے اور اپنے رکاب کی فوج سے مخاطب ہو کر کہا کہ صبر و استقلال دنیا میں عزت ہے اور عقبیٰ میں رحمت۔ دیکھنا یہ دولت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ سعید بن زید غصہ میں گھٹنے ٹیکے ہوئے کھڑے تھے۔ رومی ان کی طرف بڑھے تو شیر کی طرح جھپٹے اور مقدمہ کے افسر کو مار کر گرا دیا۔ یزید بن ابی سفیانؓ (معاویہؓ کے بھائی) بڑی ثابت قدمی سے لڑ رہے تھے۔ اتفاق سے ان کے باپ ابو سفیانؓ جو فوج کو جوش دلاتے پھرتے تھے، ان کی طرف آ نکلے۔ بیٹے کو دیکھ کر کہا، جان پدر! اس وقت میدان میں ایک ایک سپاہی شجاعت کے جوہر دکھا رہا ہے، تو سپہ سالار ہے اور سپاہیوں کی بہ نسبت تجھ پر شجاعت کا زیادہ حق ہے۔ تیری فوج میں سے ایک سپاہی بھی اس میدان میں تجھ سے بازی لے گیا تو تیرے لئے شرم کی جگہ ہے۔ شرجیل کا یہ حال تھا کہ رومیوں کا چاروں

طرف سے نرغہ تھا اور یہ بیچ میں پہاڑ کی طرح ڈٹے کھڑے تھے۔ قرآن مجید کی یہ آیت: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ [1] پڑھتے تھے اور نعرہ مارتے تھے کہ "اللہ کے ساتھ سودا کرنے والے اور اللہ کے ہمسایہ بننے والے کہاں ہیں؟" یہ آواز جس کے کان میں پڑی بے اختیار لوٹ پڑا۔ یہاں تک کہ اکھڑی ہوئی فوج پھر سنبھل گئی اور شرجیل نے ان کو لے کر اس بہادری سے جنگ کی کہ رومی جو ٹوٹے چلے آتے تھے بڑھنے سے رک گئے۔

ادھر عورتیں خیموں سے نکل نکل کر فوج کی پشت پر آ کھڑی ہوئیں اور چلا کر کہتی تھیں کہ میدان سے قدم ہٹایا تو پھر ہمارا منہ نہ دیکھنا۔

لڑائی کے دونوں پہلو اب تک برابر تھے بلکہ غلبہ کا پلہ رومیوں کی طرف تھا۔ دفعتاً قیس بن ہبیرہ جن کو خالدؓ نے فوج کا ایک حصہ دے کر میسرہ کی پشت پر متعین کر دیا تھا، عقب سے نکلے اور اس طرح ٹوٹ کر گرے کہ رومی سرداروں نے بہت سنبھالا مگر فوج سنبھل نہ سکی۔ تمام صفیں ابتر ہو گئیں اور گھبرا کر پیچھے ہٹیں۔ ساتھ ہی سعید بن زید نے قلب سے نکل کر حملہ کیا۔ رومی دور ہٹتے چلے گئے یہاں تک کہ میدان کے سرے پر جو نالہ تھا اس کے کنارے تک آ گئے۔ تھوڑی دیر میں ان کی لاشوں نے وہ نالہ بھر دیا اور میدان خالی ہو گیا۔

رومیوں کے جس قدر آدمی مارے گئے ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔ طبری اور ازدی نے لاکھ سے زیادہ تعداد بیان کی ہے۔ بلاذری نے ستر ہزار لکھا ہے۔ مسلمانوں کی طرف تین ہزار کا نقصان ہوا جن میں ضرار بن ازور، ہشام بن العاصی، ابان اور سعید وغیرہ تھے۔ قیصر انطاکیہ میں تھا کہ شکست کی خبر پہنچی۔ اسی وقت قسطنطنیہ کی تیاری کی۔ چلتے وقت شام کی طرف رخ کر کے کہا۔ "الوداع اے شام"

ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو نامہ فتح لکھا اور ایک مختصر سی سفارت بھیجی جس میں حذیفہ بن الیمان بھی تھے۔ حضرت عمرؓ یرموک کی خبر کے انتظار میں کئی دن سے سوئے نہ تھے۔ فتح کی خبر پہنچی تو دفعتاً سجدے میں گرے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ [2]

---

[1] التوبہ، ۹: ۱۱۱

[2] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۲۱۴ تا ۲۲۰

اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ شام کے انتہائی اضلاع قنسرین وغیرہ فتح کر چکے تھے۔ چنانچہ ادھر سے فرصت پا کر بیت المقدس کا رخ کیا۔ عیسائیوں نے ہمت ہار کر صلح کی درخواست کی اور مزید اطمینان کے لئے یہ شرط اضافہ کی کہ عمرؓ خود یہاں آئیں اور معاہدہ صلح ان کے ہاتھوں سے لکھا جائے۔ ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ بیت المقدس کی فتح آپ کی تشریف آوری پر موقوف ہے۔[1]

حضرت عمرؓ نے تمام معزز صحابہؓ کو جمع کیا اور مشاورت کی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ عیسائی مرعوب و شکستہ دل ہو چکے ہیں۔ آپ ان کی اس درخواست کو رد کر دیں تو ان کو اور بھی ذلت ہو گی اور یہ سمجھ کر کہ مسلمان ان کو بالکل حقیر سمجھتے ہیں بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال دیں گے لیکن حضرت علیؓ نے اس کے خلاف رائے دی۔ حضرت عمرؓ نے انہی کی رائے کو پسند کیا اور سفر کی تیاریاں کیں۔ حضرت علیؓ کو نائب مقرر[2] کر کے خلافت کے کاروبار ان کے سپرد کئے۔ اور جب ۱۶ھ میں مدینہ سے روانہ ہو گئے۔

ناظرین کو انتظار ہو گا کہ فاروق اعظمؓ کا سفر اور سفر بھی وہ جس سے دشمنوں پر اسلامی جلال کا رعب بٹھانا مقصود تھا، کس سر و سامان سے ہوا ہو گا! لیکن یہاں نقارہ و نوبت، خدم و حشم، لاؤ لشکر ایک طرف، معمولی ڈیرہ اور خیمہ تک نہ تھا۔ سواری میں گھوڑا تھا اور چند مہاجرین و انصار ساتھ تھے۔ تاہم جہاں یہ آواز پہنچتی تھی کہ فاروق اعظمؓ نے مدینہ سے شام کا ارادہ کیا ہے، زمین دہل جاتی تھی۔

سرداروں کو اطلاع دی جا چکی تھی کہ جابیہ میں آ کر ان سے ملیں۔ اطلاع کے مطابق یزید بن ابی سفیانؓ اور خالد بن ولیدؓ وغیرہ نے یہیں استقبال کیا۔ شام میں رہ کر ان افسروں میں عرب کی سادگی باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے سامنے یہ لوگ آئے تو اس ہیئت سے آئے کہ بدن پر حریر و دیبا کے چلتے اور پر تکلف قبائیں تھیں اور زرق برق پوشاک اور ظاہری شان و شوکت سے عجمی معلوم ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو سخت غصہ آیا۔ گھوڑے سے اتر

---

[1] بلاذری، فتوح البلدان، ص ۱۴۰

[2] طبری، تاریخ الامم والملوک، ۲: ۴۴۹؛ تاریخ یعقوبی میں ہے کہ حضرت عثمان بن عفان کو امور خلافت سپرد کیے گئے۔ یعقوبی، تاریخ الیعقوبی، ۲: ۱۴۷

پڑے اور سنگریزے اٹھا کر ان کی طرف پھینکے کہ اس قدر جلد تم نے عجمی عادتیں اختیار کر لیں۔

ان لوگوں نے عرض کہ قباؤں کے نیچے ہتھیار ہیں (یعنی سپہ گری کا جوہر ہاتھ سے نہیں دیا ہے) فرمایا "تو کچھ مضائقہ نہیں"۔[1] شہر کے قریب پہنچے تو ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ غوطہ کا دلفریب سبزہ زار اور دمشق کے بلند اور شاندار مکانات سامنے تھے۔ دل پر ایک خاص اثر ہوا، عبرت کے لہجہ میں یہ آیت پڑھی: كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ [2] پھر نابغہ کے چند حسرت انگیز اشعار پڑھے۔

جابیہ میں دیر تک قیام رہا اور بیت المقدس کا معاہدہ بھی یہیں لکھا گیا۔ وہاں کے عیسائیوں کو حضرت عمرؓ کی آمد کی خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ رئیسان شہر کا ایک گروہ ان سے ملنے کے لئے دمشق کو روانہ ہوا۔ حضرت عمرؓ فوج کے حلقے میں بیٹھے تھے کہ دفعتاً کچھ سوار نظر آئے جو گھوڑے اڑاتے آتے تھے اور کمر میں تلواریں چمک رہی تھیں۔ مسلمانوں نے فوراً ہتھیار سنبھال لئے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا خیر ہے؟ لوگوں نے سواروں کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے فراست سے سمجھا کہ بیت المقدس کے عیسائی ہیں فرمایا گھبراؤ نہیں یہ لوگ امان طلب کرنے آتے ہیں۔ غرض معاہدہ صلح لکھا گیا جس پر بڑے بڑے معزز صحابہؓ کے دستخط ہو گئے۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا ارادہ کیا۔ گھوڑا جو سواری میں تھا اس کے سم گھس کر بیکار ہو گئے تھے اور رک رک کر قدم رکھتا تھا۔ حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر اتر پڑے۔ لوگوں نے ترکی نسل کا ایک عمدہ گھوڑا حاضر کیا۔ گھوڑا شوخ اور چالاک تھا حضرت عمرؓ سوار ہوئے تو الیل کرنے لگا۔ فرمایا کمبخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سے سیکھی۔ یہ کہہ کر اتر پڑے اور پیادہ پیادہ چلے۔ بیت المقدس قریب آیا تو حضرت ابو عبیدہؓ اور سرداران فوج استقبال کو آئے۔ حضرت عمرؓ کا لباس اور سروسامان جس معمولی حیثیت کا تھا، اس کو دیکھ کر مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ چنانچہ لوگوں نے ترکی گھوڑا

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک، ۲: ۴۴۸

[2] الدخان، ۴۴: ۲۵

اور عمدہ قیمتی پوشاک حاضر کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے یہی بس ہے۔[1]

۸۔ جہاں آرائی

مسلمانوں نے صرف ممالک کی سرحدوں کو نہیں پھیلایا بلکہ علمی دنیا میں بھی اپنی فتوحات کے دروازے کھولے۔ مسلمانوں کی علمی ترقی نے نہ صرف تہذیبی ارتقاء کو جلا بخشی بلکہ انہوں نے مختلف سائنسی شعبوں میں نمایاں کام کیا، خاص طور پر علمِ ہیئت و فلکیات میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ مسلمانوں کے ماہرینِ فلکیات نے یونانی فلسفے کے پیچیدہ اثرات میں پھنسے ہوئے علمِ ہیئت کو نیا سمت دی اور اسے سائنسی بنیادوں پر استوار کیا۔ یہ مسلم سائنسدان تھے جنہوں نے فلکیات کو ایک منظم، تجرباتی اور ریاضیاتی اصولوں پر قائم کیا۔ انہوں نے نئے فلکیاتی آلات تیار کیے، جیسے اسطرلاب، اور فلکیاتی مشاہدات کی بنیاد پر نئے سائنسی اصول وضع کیے۔ ان کی تحقیق نے نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے فلکیات کے میدان میں نئے دروازے کھولے۔

مغربی زبانوں میں آج بھی بے شمار اَجرام سماوی کے نام عربی میں موجود ہیں، کیونکہ یہ نام مسلم ماہرینِ فلکیات کی دریافتوں پر مبنی ہیں۔ جیسے کہ "الکبّہ" (The Cluster) اور "البرج" (The Zodiac) جیسے نام آج بھی عربی میں ہیں، جو ان مسلم ماہرین کی علمی تحقیقات کا عکاس ہیں۔ ان کی دریافتوں اور تحقیقات نے مغربی دنیا کو بھی سائنسی ترقی کے نئے راستے دکھائے اور فلکیات کے علم کو ایک نئی حقیقت کا دروازہ فراہم کیا۔ یوں مسلمانوں کی علمی فتوحات نہ صرف ان کے اپنے عہد میں، بلکہ بعد میں بھی دنیا بھر میں سائنسی ترقی کی بنیاد بنیں، اور انہوں نے فلکیات کے میدان میں اپنی جرات مندانہ اور اہم تحقیقات کے ذریعے انسانیت کے علم و فہم میں بے شمار اضافہ کیا۔ عظیم مغربی مورخ فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) لکھتا ہے:

> Not only are most of the star ....names in European languages of Arabic origins .... but a numbers of

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۲۲۲ تا ۲۲۵

technical terms .... are likewise of Arabic etymology and testify to the rich legacy of Islam to Christian Europe.[1]

"یورپ کی زبانوں میں نہ صرف بہت سے ستاروں کے نام عربی الاصل (عربی زبان سے نکلنے والے) ہیں بلکہ لاتعداد اِصطلاحات بھی داخل کی گئی ہیں جو یورپ پر اِسلام کی بھرپور وراثت کی مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں۔"

مسلمانوں کی علم الفلکیات میں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ول ڈیورانٹ (Will Durant) لکھتا ہے:

.... The Caliph al-Mamun engaged a staff of astronomers to make observations and records, to test the findings of Ptolemy, and to study the spots on the sun. Taking for granted the sphericity of the earth, they measured a terrestrial degree by simultaneously taking the position of the sun from both Palmyra and the plain of Sinjar; their measurement gave 56.66 miles--half a mile more than our present calculation; and from their results they estimated the earth's circumference to approximate 20,000 miles.[2]

"..... یہاں خلیفہ مامون نے ماہرین فلکیات کو متعین کیا کہ وہ تحقیق و تدوین کریں، بطلیموس کے نتائج کو پرکھیں اور سورج کے دھبوں کا مطالعہ کریں۔ زمین کو گول تصور کرتے ہوئے انہوں نے زمین کی گولائی کے درجے کی پیائش ۵۶.۶۶ میل بیان کی۔ اس کے لئے انہوں نے پالیمرا اور سنجر کے میدان سے سورج کے مقام کا تعین کیا۔ ان کی پیائش ہماری موجودہ پیائش سے صرف نصف ایک میل زیادہ ہے۔ اپنے ان نتائج سے انہوں نے زمین کا محیط تقریباً بیس ہزار (۲۰۰۰۰) میل بیان کیا۔"

اندلس کے عظیم مسلمان سائنسدان ابنِ رشد.... جسے مغرب میں Averroes کے بدلے ہوئے نام سے یاد کیا جاتا ہے .... نے سورج کی سطح کے دھبوں (sunspots) کو پہچانا۔ Gregorian کیلنڈر کی اِصلاحات 'عمر خیام' نے مرتب کیں۔[3] خلیفہ مامون الرشید

---

1 Philip K. Hitti, History of the Arabs, pp. 568-573.

2 Will Durant, *The Age of Faith*, p. 242.

3 Will Durant, *The Age of Faith*, p. 309.

کے زمانہ میں زمین کے محیط کی پیمائشیں عمل میں آئیں، جن کے نتائج کی درُستگی آج کے ماہرین کے لئے بھی حیران کن ہے۔ سورج اور چاند کی گردِش، سورج گرہن، علمُ المیقات (timekeeping) اور بہت سے سیاروں کے بارے میں غیر معمولی سائنسی معلومات بھی البتانی اور البیرونی جیسے نامور مسلم سائنسدانوں نے فراہم کیں۔[1]

جدید دنیا مسلمانوں کی جہاں آرائی کی رہین

جدید دنیا مسلمانوں کی بے شمار علمی و ثقافتی خدمات کی مرہونِ منت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے ذریعے انسانیت نے قدیم دور سے جدید دور میں قدم رکھا۔ قرآن حکیم اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات نے تاریخِ انسانیت میں پہلی بار ایک ایسا علمی سفر شروع کیا، جس نے کائنات کی تسخیر کے راستے کھولے، اور یہ سفر مشاہدہ، تجزیہ اور تجربے کی بنیاد پر استوار تھا۔ مسلمانوں نے نہ صرف قدیم توہمات اور غیر سائنسی نظریات کی تاریکیوں کو حقیقت کی روشنی سے دور کیا، بلکہ علم کے مختلف شعبوں میں ایسے انکشافات کیے جو آج بھی دنیا میں بے نظیر ہیں۔

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کی کامیابیاں ایک منفرد مثال ہیں۔ ان کی ساری توجہ مشاہدہ اور تجربہ پر مرکوز تھی، اور انہوں نے کبھی بھی اپنے دل و دماغ کو توہمات یا غیر سائنسی تصورات سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے علم کو حقیقت کی بنیاد پر قائم کیا اور اپنی علمی جستجو کے ذریعے دنیا کو نئے افق دکھائے۔ ان کی علمی تحقیق اور سائنسی ترقیات نے نہ صرف مسلمانوں کی تہذیب کو عروج بخشا بلکہ پوری انسانیت کے لیے نئی راہیں متعارف کرائیں۔[2]

اس کا اندازہ مسلمانوں کے علمی سفر سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے علم کے ان اسرار کا انکشاف کیا جن کی پہلے کوئی بنیاد بھی موجود نہ تھی۔ مثلاً ریاضی میں ابو کامل نے چوتھے درجے کی مساواتوں کے حل کا نظام وضع کیا اور غیر متعین مساواتوں کے لئے ۲۶۷۶ حل پیش

---

1 Howard R. Turner, *Science in Medical Islam: An Illustrated Introduction*, p. 66.

2 Mashhad Al-Allaf, The Essence of Islamic Philosophy, p. 244.

کئے۔[1] قاہرہ بیت الحکمت کے ابن یونس نے فلکیاتی مسائل کے حل کے لئے طویل ترین ضربوں کے سوالات کو آسان جمع تفریق میں بدل دیا۔ ابن یونس کے طریقہ حساب کو ڈنمارک کے ماہر فلکیات ٹائیکو براہی (Tycho Brahe) نے ۵۰۰ سال بعد استعمال کیا۔ ابن یونس نے Sine1o کی حقیقی قدر کو کروڑویں درجے تک معلوم کرنے کا طریقہ بھی دریافت کیا۔[2] طبیعیات میں 'مسئلہ ابن الہیثم' (Alhazen Problem) صدیوں تک یورپی اہل علم کا موضوع تحقیق رہا۔ سترہویں صدی میں کرسچن ہائجنس (Christian Huygens) اور آئزک بارو (Isaac Barow) نے اس میں خصوصی دلچسپی لی۔ راجر بیکن (Roger Bacon) اور کیپلر (Kepler) ابن الہیثم سے براہ راست متاثر تھے۔[3] ابن الہیثم کے دیے ہوئے چوکور (Quadrangle) کے زاویوں کی پیمائش کے ضابطوں کو مغربی ماہر ریاضی لیمبرٹ (Lambert, J. H) نے ۷۰۰ سال بعد سترہویں صدی میں استعمال کیا۔[4] ابن الہیثم کے شاگرد حسین ابن اسحاق کی تصنیف 'العشر مقالات فی العین' (Ten Treatises on Eye) مغرب میں صدیوں تک امراض چشم کی نصابی کتاب رہی۔[5] ابن رشد اور عبدالملک ابن ابوزہر نے صدیوں قبل اپنی تصانیف میں امراضِ نسواں (Gynecology) کو تفصیل سے بیان کیا۔[6] مغرب پر اسلام کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے واٹ (Watt M. Watt) لکھتا ہے:

---

1 Ivan Van Sertima, African Presence in Early Europe, Journal of African Civilization Ltd. Inc. Rutgers, The State university NJ, 2000, p. 181.

2 Ivan Van Sertima, African Presence in Early Europe, Journal of African Civilization Ltd. Inc. Rutgers, The State university NJ, 2000, pp. 181-2.

3 Ivan Van Sertima, "African Presence in Early Europe", *Journal of African Civilization Ltd.* Inc. Rutgers, The State university NJ, 2000, pp. 182.

4 ibid, p. 183

5 Philip K. Hitti, History of the Arabs, p. 364.

6 Michael J. O'Dowd, The History of Medication for Women, p. 113.

A statistician has argued that the numbers of references in the standard early European works show conclusively that Arab influence was much greater than Greek.[1]

''ایک ماہر شماریات کے مطابق اعداد و شمار اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ ابتدائی معیاری یورپی تصانیف میں موجود حوالہ جات کی تعداد یہ ظاہر کرتی ہے کہ یورپ پر یونان کی نسبت عربوں (اسلام) کا اثر بہت زیادہ ہے۔''

اسلام کی تمام علمی، فکری اور سائنسی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو ایک ایسا شعور دیا جس کی بدولت ان کی تمام علمی، فکری اور سائنسی کامیابیاں انسانی فلاح و بہبود اور تہذیب کی ترقی کی ضامن بنیں۔ یہ کامیابیاں محض مادی ترقی تک محدود نہیں رہیں، بلکہ ان کا مقصد ہمیشہ تعمیر، ترقی اور انسانیت کی بھلائی رہا۔ ان میں کبھی بھی تخریب یا تباہی کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا۔ تاہم، پچھلی دو تین صدیوں کے دوران مغرب میں ہونے والی علمی ترقی نے انسانیت کو سنگین خطرات کی طرف دھکیل دیا ہے۔ مغرب نے جدید ٹیکنالوجی متعارف کروا کر چاہے وہ پرامن ہو یا عسکری، دنیا کو ایک بحران کا شکار کر دیا ہے، جس نے انسانیت کی بقا کے اصولوں کو چیلنج کیا۔[2]

آج انسانیت کو ایسی علمی روایت کی ضرورت ہے جو فلاح اور بقا پر مبنی ہو، وہی علمی روایت جس کی ابتدا مسلمانوں نے کی تھی اور جو قرآن حکیم اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے جڑی ہوئی تھی۔ اس علمی اور سائنسی روایت کی تجدید مسلمانوں پر تاریخ کا ایک بڑا قرض ہے کیونکہ اسی میں انسانیت کی حقیقی فلاح پنہاں ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس سے مسلمان موجودہ جمود سے نکل کر اپنی حقیقی عظمت کی طرف واپس جاسکتے ہیں اور وہ بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں جس کے لیے انہیں پیدا کیا گیا تھا۔ اس روایت کی تجدید نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک نیا روشن باب ہے، جس سے عالمگیر امن، ترقی اور فلاح کی راہیں کھلیں گی۔

---

1 Watt M. Watt, The Influence of Islam on Medieval Europe, p. 67.

2 Roger M. Savory, *Introduction to Islamic Civilization*, p. 5.

(۶)

کہ تُو گُفتار وہ کردار، تُو ثابت وہ سیّارا

۹۔ گفتار و کردار

علامہ اقبال مسلم نوجوانوں سے مخاطب ہو کر انہیں بتا رہے ہیں کہ ہمارے عظیم اجداد ہمیشہ عمل اور جستجو کی حالت میں تھے، چاہے وہ دن ہو یا رات۔ ان کی زندگی میں فراغت، کاہلی یا بے عملی کا تصور تک نہ تھا۔ ان کے لیے ہر لمحہ ایک نئی کوشش اور نئی کامیابی کے حصول کا ذریعہ ہوتا تھا۔ ان کے کردار میں عزم، محنت اور لگن کی ایسی صفات تھیں کہ انہوں نے اپنی تہذیب کو بلند کیا اور دنیا کے سامنے ایک شاندار نمونہ پیش کیا۔ تاہم، اقبال کا کہنا ہے کہ آج کا مسلم نوجوان اس عہد کے برعکس ہے، جس میں عمل کی کمی اور سست روی پائی جاتی ہے۔ ان کے اندر وہ جذبہ اور متحرک قوت نہیں رہی جو ایک زمانے میں مسلمانوں کا طرہ امتیاز تھی۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین سے لے کر عظیم سائنسی و فلسفی شخصیات جیسے ابنِ سینا، فارابی، الزہراوی اور دیگر تمام مسلمان مفکرین اور سائنسدانوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ انسانیت اور علم کی جستجو میں گزارا۔ انہوں نے نہ صرف اپنی دنیا کو بہتر بنایا بلکہ ساری انسانیت کے لیے علم و حکمت کی روشنی بھی فراہم کی۔ ان کی فتوحات، سائنسی تحقیق، فلسفیانہ افکار اور تہذیبی ترقی کی بدولت مسلمانوں نے پوری دنیا میں ایک نئی روشنی پھیلائی، اور یہ کامیابیاں ان کے مسلسل عمل اور محنت کا نتیجہ تھیں۔

تاہم، آج کے مسلمان نوجوان کے لیے یہ سوال ہے کہ وہ اس عظمت کے ورثے کو کس طرح دوبارہ حاصل کرے گا؟ علامہ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ نوجوانوں کو اپنے اجداد کے

نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے اندر عمل کی روح بیدار کرنی چاہیے، تاکہ وہ اپنی قوم کی عظمت کو واپس لا سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی زندگی میں محنت، عزم اور جستجو کو اپنا شعار بنائیں اور دنیا کے سامنے ایک نئی مثال قائم کریں، جیسا کہ ہمارے اجداد نے کیا تھا۔ علامہ اقبال کے اس موقف کی تائید مسلمانوں کی شاندار تاریخ یوں کرتی ہے:

جس وقت لڑائی کا ہنگامہ گرم تھا، ابو محجن ثقفی جو ایک مشہور بہادر اور شاعر تھے اور جن کو شراب پینے کے جرم پر سعدؓ نے قید کر دیا تھا، قید خانے کے دریچے سے لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے اور شجاعت کے جوش میں بے اختیار ہوئے جاتے تھے۔ آخر ضبط نہ کر سکے، سلمیٰؓ (سعدؓ کی بیوی) کے پاس گئے کہ اللہ کے لیے اس وقت مجھ کو چھوڑ دو لڑائی سے جیتا بچا تو خود آ کر میں بیڑیاں پہن لوں گا۔ سلمیٰؓ نے انکار کیا۔ یہ حسرت کے ساتھ واپس آئے اور بار بار پر درد لہجے میں یہ اشعار پڑھتے تھے:

كَفَى حَزَنًا أَنْ تَرْتَدِي الْخَيْلُ بِالْقَنَا
وَأُتْرَكَ مَشْدُودًا عَلَيَّ وَثَاقِيَا
إِذَا قُمْتُ عَنَّانِي الْحَدِيدُ وَأُغْلِقَتْ
مَصَارِيعُ دُونِي قَدْ تُصِمُّ الْمُنَادِيَا
وَقَدْ كُنْتُ ذَا مَالٍ كَثِيرٍ وَإِخْوَةٍ
فَقَدْ تَرَكُونِي وَاحِدًا لَا أَخَا لِيَا[1]

"اس سے بڑھ کر کیا غم ہو گا کہ سوار نیزہ بازیاں کر رہے ہیں اور میں زنجیروں میں بندھا پڑا ہوں"۔

"جب کھڑا ہونا چاہتا ہوں تو زنجیر اٹھنے نہیں دیتی اور دروازے اس طرح بند کر دیے جاتے ہیں کہ پکارنے والا پکارتے پکارتے تھک جاتا ہے"۔

"میرے پاس بہت مال اور بھائی ہیں لیکن میرے بھائیوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے اس لیے اب میرا کوئی بھائی نہیں۔"

---

[1] ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، ۲: ۳۲۴

ان اشعار نے سلمیٰؓ کے دل پر یہ اثر کیا کہ خود آ کر بیڑیاں کاٹ ڈالیں۔ انہوں نے فوراً اصطبل میں جا کر سعدؓ کے گھوڑے پر جس کا نام بلقا تھا، زین کسی اور میدان جنگ میں پہنچ کر بھالے کے ہاتھ نکالتے ہوئے ایک دفعہ میمنہ سے میسرہ تک کا چکر لگایا اور پھر اس زور و شور سے حملہ کیا کہ جس طرح نکل گئے صف کی صف الٹ دی۔ تمام لشکر متحیر تھا کہ یہ کون بہادر ہے۔ سعدؓ بھی حیران تھے اور دل میں کہتے تھے کہ حملہ کا انداز ابو محجن کا ہے لیکن وہ تو قید خانے میں ہے۔ شام ہوئی تو ابو محجن نے قید خانے میں آ کر خود بیڑیاں پہن لیں۔ سلمیٰؓ نے یہ تمام حالات سعدؓ سے بیان کیے۔ سعدؓ نے اسی وقت ان کو رہا کر دیا اور کہا: اللہ کی قسم! مسلمانوں پر جو شخص یوں نثار ہو میں اس کو سزا نہیں دے سکتا۔ ابو محجن نے کہا:

وَأما الْيَوْم فو الله لَا أَشْرَبُهَا أَبَدًا.[1]

واللہ میں بھی آج سے پھر کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

عرب کی مشہور شاعرہ خنساء[2] اس معرکے اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ شریک تھی، جب لڑائی شروع ہوئی تو اس نے بیٹوں سے خطاب کیا اور کہا:

ولم تنب بكم البلاد ولم تقحمكم السنة ثم جئتم بأمكم عجوز كبيرة فوضعتموها بين يدي أهل فارس إنكم لبنو رجل واحد كما أنكم بنو امرأة واحدة ما خنت أباكم ولا فضحت خالكم انطلقوا فاشهدوا أول القتال وآخره.[3]

"پیارے بیٹو! تم اپنے ملک کو دو بھر نہ تھے نہ تم پر قحط پڑا تھا۔ باوجود اس کے تم اپنی کہن سال ماں کو یہاں لائے اور فارس کے آگے ڈال دیا اللہ کی قسم جس طرح تم ایک ماں کی اولاد ہو

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۴۲

[2] خنساء صاحب دیوان شاعرہ ہیں۔ اس کا دیوان بیروت میں چھپ گیا ہے اور اس کے مفصل حالات علامہ ابو الفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی میں لکھے ہیں۔ اصناف شعر میں مرثیہ گوئی میں اس کا کوئی نظیر نہیں گزرا۔ چنانچہ بازار عکاظ میں اس کے خیمے کے دروزے پر ایک علم نصب کیا جاتا تھا جس پر لکھا ہوتا تھا ارثی العرب یعنی تمام عرب میں سب سے بڑھ کر مرثیہ گو۔ وہ اسلام بھی لائی اور حضرت عمرؓ کے دربار میں حاضر ہوتی تھی۔ ابن جوزی نے صفۃ الصفوۃ میں ان کا تذکرہ اہل عرب کی عابدات میں کیا ہے۔ (ابن جوزی، صفۃ الصفوۃ، ۴: ۳۸۵، الرقم: ۹۲۶)

[3] ابن طبری، تاریخ الامم والملوک، ۲: ۴۱۳

اسی طرح ایک باپ کی بھی ہو۔ میں نے تمہارے باپ سے بد دیانتی نہیں کی نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا لو جاؤ اور اخیر تک لڑو"۔

بیٹوں نے ایک ساتھ باگیں اٹھائیں اور دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ جب نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو خنساء نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا کہ اے اللہ! میرے بیٹوں کو بچانا۔[1]

دوسرے دن ابوعبیدہؓ دمشق سے روانہ ہوئے اور اردن کی حدود پر یرموک پہنچ کر قیام کیا۔ عمرو بن العاصؓ بھی یہیں آکر ملے۔ یہ موقع جنگ کی ضرورتوں کے لیے اس لحاظ سے مناسب تھا کہ عرب کی سرحد بہ نسبت اور تمام مقامات کے یہاں سے قریب تھی اور پشت پر عرب کی سرحد تک کھلا میدان تھا جس سے یہ موقع حاصل تھا کہ ضرورت پر جہاں تک چاہیں پیچھے ہٹتے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے سعید بن عامرؓ کے ساتھ جو فوج روانہ کی تھی وہ ابھی نہیں پہنچی تھی۔ ادھر رومیوں کی آمد اور ان کے سامان کا حال سن سن کر مسلمان گھبرائے جاتے تھے۔ ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس ایک اور قاصد دوڑایا اور لکھا کہ رومی بحر و بر سے ابل پڑے ہیں اور جوش کا یہ حال ہے کہ فوج جس راہ سے گزرتی ہے راہب اور خانقاہ نشین جنہوں نے کبھی خلوت سے باہر قدم نہیں نکالا، نکل نکل کر فوج کے ساتھ ہوتے جاتے ہیں۔ خط پہنچا تو حضرت عمرؓ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور خط پڑھ کر سنایا۔

تمام صحابہؓ بے اختیار رو پڑے اور نہایت جوش کے ساتھ پکار کر کہا کہ امیر المومنین! اللہ کے لیے ہم کو اجازت دیں کہ ہم اپنے بھائیوں پر جا کر نثار ہو جائیں۔ خدانخواستہ ان کا بال بیکا ہوا تو پھر جینا بے سود ہے۔ مہاجرین و انصار کا جوش برابر بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ امیر المومنین! تو خود سپہ سالار بن اور ہم کو ساتھ لے کر چل۔ لیکن اور صحابہؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور رائے یہ ٹھہری کہ امدادی فوجیں بھیجی جائیں۔ حضرت عمرؓ نے قاصد سے دریافت کیا کہ دشمن کہاں تک آگئے ہیں؟ اس نے کہا کہ یرموک سے تین چار منزل کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نہایت غم زدہ ہوئے اور فرمایا کہ افسوس اب کیا ہو سکتا ہے کہ اتنے عرصے میں کیونکر مدد پہنچ سکتی ہے۔ ابوعبیدہؓ کے نام نہایت پر

---

[1] الفاروق، ص ۱۶۸ تا ۱۷۷

تاثیر الفاظ میں ایک خط لکھا اور قاصد سے کہا کہ خود ایک ایک صف میں جا کر یہ خط سنانا اور زبانی کہنا:

إن عمر ابن الخطاب يسلم عليكم ويقول لكم: يا أهل الايمان! أصدقوهم الحرب عند اللقاء وشدوا عليهم شد الليوث وأضربوا هاماتهم بالسيوف وليكونوا عليكم أهون من الذباب فانكم المنصورون عليهم أن شاء الله تعالى.[1]

"بے شک عمر بن خطاب تم کو سلام کرتا ہے اور اے اہل ایمان! تمہیں کہتا ہے کہ جنگ کے وقت ثابت قدم رہنا اور شیروں کی طرح ان پر حملہ کرنا اور ان کے سروں پر تلواروں سے وار کرنا تاکہ وہ تمہارے لیے مکھیوں سے بھی کم تر ہو جائیں، ان کے مقابلے میں ان شاء اللہ تمہاری مدد کی جائے گی۔"

یہ عجیب حسن اتفاق ہوا کہ جس دن قاصد ابو عبیدہؓ کے پاس آیا اسی دن عامرؓ بھی ہزار آدمی کے ساتھ پہنچ گئے۔ مسلمانوں کو نہایت تقویت ملی اور انہوں نے نہایت استقلال سے لڑائی کی تیاریاں شروع کیں۔ رومی فوجیں یرموک کے مقابل دیر الجبل میں اتریں۔ خالدؓ نے لڑائی کی تیاریاں شروع کیں۔ معاذ بن جبلؓ کو جو بڑے رتبے کے صحابی تھے، میمنہ پر مقرر کیا۔ قباث بن اشیم کو میسرہ اور ہاشم بن عتبہ کو پیدل فوج پر افسری دی۔ اپنے رکاب کی فوج کے چار حصے کیے۔ ایک کو اپنی رکاب میں رکھا باقی پر قیس بن ہبیرہ، میسرہ بن مسروق عمرو بن الطفیل کو مقرر کیا۔ یہ تینوں بہادر تمام عرب میں منتخب تھے اور اس وجہ سے فارس العرب کہلاتے تھے۔ رومی بھی بڑے سروسامان سے نکلے۔ دو لاکھ سے زیادہ جمعیت تھی اور ۲۴ صفیں تھیں جن کے آگے آگے ان کے مذہبی پیشوا ہاتھوں میں صلیبیں لیے جوش دلاتے جاتے تھے۔ فوجیں بالکل مقابل آ گئیں تو ایک گھڑ سوار جنگو صف چیر کر نکلا اور کہنے لگا کہ میں تنہا لڑنا چاہتا ہوں۔ میسرہ بن مسروق نے گھوڑا بڑھایا مگر چونکہ حریف نہایت تنومند اور جوان تھا اس لیے خالدؓ نے روکا اور قیس بن ہبیرہ کی طرف دیکھا وہ یہ اشعار پڑھتے بڑھے:

سائل نساء الحي في حجلاتها
ألست يوم الحرب من أبطالها[1]

---

[1] واقدی، فتوح الشام، ۱: ۱۷۹؛ کلاعی، الاکتفاء بما تضمنہ من مغازی رسول اللہ والثلاثۃ الخلفاء، ۳:۲۴۳

''پردہ نشین عورتوں سے پوچھ لو کیا میں لڑائی کے دن بہادروں کے کام نہیں کرتا''۔
قیس اس طرح جھپٹ کر پہنچے کہ وہ جنگجو ہتھیار بھی نہیں سنبھال سکا تھا ان کا وار چل گیا۔ تلوار سر پر پڑی اور خود کو کاٹتی ہوئی گردن تک اتر آئی۔ گھڑ سوار ڈگمگا کر گھوڑے سے گرا ساتھ ہی مسلمانوں نے تکبیر کا نعرہ مارا۔ خالدؓ نے کہا شگون اچھا ہوا اور اب اللہ نے چاہا تو آگے فتح ہے۔ عیسائیوں نے خالدؓ کے ہمرکاب افسروں کے مقابلے میں جدا جدا فوجیں متعین کی تھیں لیکن سب نے شکست کھائی۔ اس دن یہیں تک نوبت پہنچ کر لڑائی ملتوی رہ گئی۔

رات کو باہان نے سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ عربوں کو شام کی دولت و نعمت کا مزہ پڑ چکا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مال و زر کی طمع دلا کر ان کو یہاں سے ٹالا جائے۔ سب نے اس رائے پر اتفاق کیا۔ دوسرے دن ابوعبیدہؓ کے پاس قاصد بھیجا کہ کسی معزز افسر کو ہمارے پاس بھیج دو۔ ہم اس سے صلح کرنا چاہتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے خالدؓ کا انتخاب کیا۔ قاصد جو پیغام لے کر آیا س کا نام جارج تھا۔ جس وقت وہ پہنچا شام ہو چکی تھی۔ ذرا دیر کے بعد مغرب کی نماز شروع ہوئی۔ مسلمان جس ذوق و شوق سے تکبیر کہہ کر کھڑے ہوئے اور جس محویت، سکون و قار، ادب و خضوع سے انہوں نے نماز ادا کی قاصد نہایت حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھتا رہا یہاں تک کہ جب نماز ختم ہو چکی تو اس نے ابوعبیدہؓ سے چند سوالات کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ ابوعبیدہؓ نے قرآن مجید کی یہ آیتیں پڑھیں:

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا○ لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ[۲]

''اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں حد سے زائد نہ بڑھو اور اللہ کی شان میں سچ کے سوا کچھ نہ کہو، حقیقت صرف یہ ہے کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے جسے اس نے مریم کی طرف پہنچا دیا اور اس (کی طرف) سے ایک روح ہے۔ پس تم اللہ

---

۱ کلاعی، ابوربیع سلیمان الاکتفاء بما تضمنہ من مغازی رسول اللہ والثلاثۃ الخلفاء، ۳:۲۴۷

۲ النساء، ۴: ۱۷۱ – ۱۷۲

اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ (معبود) تین ہیں، (اس عقیدہ سے) باز آ جاؤ، (یہ) تمہارے لیے بہتر ہے۔ بے شک اللہ ہی یکتا معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے لیے کوئی اولاد ہو، (سب کچھ) اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کا کارساز ہونا کافی ہےo مسیح (علیہ السلام) اس (بات) سے ہرگز عار نہیں رکھتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ ہی مقرّب فرشتوں کو (اس سے کوئی عار ہے)۔''

مترجم نے ان الفاظ کا ترجمہ کیا تو جارج بے اختیار پکار اٹھا بے شک عیسیٰ کے یہی اوصاف ہیں اور بے شک تمہارا پیغمبر سچا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے کلمہ توحید پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ وہ اپنی قوم کے پاس واپس جانا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے اس خیال سے کہ رومیوں کو بد عہدی کا گمان نہ ہو، مجبور کیا اور کہا کہ یہاں سے جو سفیر جائے گا اس کے ساتھ چلے آنا۔

دوسرے دن خالدؓ رومیوں کی لشکر گاہ میں گئے۔ رومیوں نے اپنی شوکت دکھانے کے لیے پہلے سے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ راستے کے دونوں جانب دور تک سواروں کی صفیں قائم کی تھیں جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھے لیکن خالدؓ اس بے پروائی اور تحقیر کی نگاہ سے ان پر نظر ڈالتے جاتے تھے کہ جس طرح شیر بکریوں کے ریوڑ کو چیرتا چلا جاتا ہے۔ باہان کے خیمے کے پاس رکے تو نہایت احترام کے ساتھ اس نے استقبال کیا اور لا کر اپنے برابر بٹھایا۔ مترجم کے ذریعے گفتگو شروع ہوئی۔ باہان نے معمولی بات چیت کے بعد لیکچر کے طریقے پر تقریر شروع کی۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعریف کے بعد قیصر کا نام لیا اور فخر سے کہا کہ ہمارا بادشاہ تمام بادشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ مترجم ان الفاظ کا پورا ترجمہ نہیں کر پایا تھا کہ خالدؓ نے باہان کو روک دیا اور کہا کہ تمہارا بادشاہ ایسا ہو گا لیکن ہم نے جس کو اپنا سردار بنا رکھا ہے اس کو ایک لحظہ کے لیے اگر بادشاہی کا خیال آئے تو فوراً اس کو معزول کر دیں۔ باہان نے پھر تقریر شروع کی اور اپنے جاہ و دولت کا فخر بیان کر کے کہا کہ اہل عرب! تمہاری قوم کے جو لوگ ہمارے ملک میں آ کر آباد ہوئے ہم نے ہمیشہ ان کے ساتھ دوستانہ سلوک کیے۔ ہمارا خیال تھا کہ ان مراعات کا تمام عرب ممنون ہو گا لیکن خلاف توقع تم ہمارے ملک پر چڑھ آئے اور چاہتے ہو کہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال دو، تم کو معلوم نہیں کہ بہت سی قوموں نے بارہا ایسے ارادے کیے لیکن کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ اب تم کو کہ تمام دنیا میں تم سے زیادہ کوئی قوم جاہل، وحشی اور بے سروسامان نہیں، یہ حوصلہ ہوا ہے۔ ہم اس پر بھی درگزر

کرتے ہیں بلکہ اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو انعام کے طور پر سپہ سالار کو دس ہزار دینار اور افسروں کو ہزار ہزار اور عام سپاہیوں کو سو سو دینار دلا دیے جائیں گے۔

بابان اپنی تقریر ختم کر چکا تو خالدؓ اٹھے اور حمد و نعت کے بعد کہا کہ بلاشبہ تم دولت مند ہو، مالدار ہو، صاحب حکومت ہو، تم نے اپنے ہمسایہ عربوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ہم کو بھی معلوم ہے لیکن یہ تمہارا کچھ احسان نہ تھا بلکہ اشاعت مذہب کی ایک تدبیر تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ وہ عیسائی ہو گئے اور آج خود ہمارے مقابلے میں تمہارے ساتھ ہو کر لڑتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم نہایت محتاج، تنگدست اور خانہ بدوش تھے، ہمارے ظلم و جہالت کا یہ حال تھا کہ قوی کمزور کو پیس ڈالتا تھا، قبائل آپس میں لڑ لڑ کر برباد ہوتے جاتے تھے، بہت سے معبود بنا رکھے تھے اور ان کو پوجتے تھے، اپنے ہاتھ سے بت تراشتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحم کیا اور ایک پیغمبر بھیجا جو خود ہماری قوم سے تھا اور ہم میں سے سب سے زیادہ شریف، زیادہ فیاض، زیادہ پاک خو تھا۔ اس نے ہم کو توحید سکھائی اور بتا دیا کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں وہ بیوی اور اولاد نہیں رکھتا اور بالکل یکتا و یگانہ ہے۔ اس نے ہم کو بھی یہ حکم دیا کہ ہم ان عقائد کو تمام دنیا کے سامنے پیش کریں جس نے ان کو مانا وہ مسلمان ہے اور ہمارا بھائی ہے، جس نے نہ مانا لیکن جزیہ دینا قبول کیا اس کی ہم حامی اور محافظ ہیں۔ جس کو دونوں سے انکار ہو اس کے لیے تلوار ہے۔

بابان نے جزیہ کا نام سن کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے لشکر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ مر کر بھی جزیہ نہ دیں گے۔ ہم جزیہ لیتے ہیں دیتے نہیں۔ غرض کوئی معاملہ طے نہیں ہوا اور خالدؓ اٹھ کر چلے آئے۔ اب اس آخری لڑائی کی تیاریاں شروع ہوئیں جس کے بعد رومی پھر کبھی سنبھل نہ سکے۔ خالدؓ کے چلے آنے کے بعد بابان نے سرداروں کو جمع کیا اور کہا کہ تم نے سنا کہ عرب کو دعویٰ ہے کہ جب تک تم ان کی رعایا نہ بن جاؤ ان کے حملے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ تم کو ان کی غلامی منظور ہے؟ تمام افسروں نے بڑے جوش سے کہا کہ ہم مر جائیں گے مگر یہ ذلت گوارا نہیں ہو سکتی۔[1]

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۲۰۶ تا ۲۱۲

اس لڑائی کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی، حباس بن قیس القشیری جو ایک بہادر سپاہی تھے اور بڑی جانبازی سے لڑ رہے تھے۔ اسی اثناء میں کسی نے ان کے پاؤں پر تلوار ماری اور ایک پاؤں کٹ کر الگ ہو گیا۔ حباس کو خبر تک نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ میرے پاؤں کو کیا ہوا؟ ان کے قبیلے کے لوگ اس واقعہ پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔[1] چنانچہ سوار بن اوفی ایک شاعر نے کہا

ومنا ابن عتاب وناشد رجله

ومنا الذي أدى إلى الحي حاجبا[2]

بایں ہمہ ان (حضرت خالد) کو بالکل معزول نہیں کیا بلکہ ابو عبیدہؓ کے ماتحت کر دیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۷ھ (۶۳۸ء) میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالدؓ نے ایک شاعر کو دس ہزار روپے انعام میں دے دیئے۔ پرچہ نویسوں نے اسی وقت حضرت عمرؓ کو پرچہ لکھا۔ حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہؓ کو خط لکھا کہ خالدؓ نے یہ انعام اپنی گرہ سے دیا تو اسراف کیا اور بیت المال سے دیا تو خیانت کی، دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔

خالدؓ جس کیفیت سے معزول کئے گئے وہ سننے کے قابل ہے۔ قاصد نے جو معزولی کا خط لے کر آیا تھا، مجمع عام میں خالدؓ سے پوچھا کہ یہ انعام تم نے کہاں سے دیا؟ خالدؓ اگر اپنی خطا کا اقرار کر لیتے تو حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ ان سے درگزر کی جائے لیکن وہ خطا کے اقرار کرنے پر راضی نہ تھے۔ مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر ان کے سر سے ٹوپی اتار لی اور ان کی سرتابی کی سزا کے لئے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی۔ یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایک ایسا سپہ سالار جس کی نظیر تمام اسلام میں کوئی شخص موجود نہ تھا اور جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا، اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور مطلق دم نہیں مارتا۔ اس واقعہ سے ایک طرف تو خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہے اور دوسری طرف حضرت عمرؓ کی سطوت و جلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۲۱۹

[2] بلاذری، فتوح البلدان، ص ۱۴۳

خالدؓ نے حمص پہنچ کر اپنی معزولی کے متعلق ایک تقریر کی۔ تقریر میں یہ بھی کہا کہ امیر المومنین عمرؓ نے مجھ کو شام کا افسر مقرر کیا اور جب میں نے تمام شام کو زیر کر لیا تو مجھ کو معزول کر دیا۔ اس فقرے پر ایک سپاہی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے سردار چپ رہ! ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ خالدؓ نے کہا: ہاں!

أَمَا وَابْنُ الْخَطَّابِ حَيٌّ فَلا.[1]

لیکن عمرؓ کے ہوتے فتنہ کا کیا احتمال ہے؟

خالدؓ مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ عمرؓ اللہ کی قسم! تم میرے معاملہ میں ناانصاف کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟ خالدؓ نے کہا کہ مال غنیمت سے اور یہ کہہ کر کہا کہ ساٹھ ہزار سے جس قدر زیادہ رقم نکلے وہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ چنانچہ بیس ہزار روپے زیادہ نکلے اور وہ بیت المال میں داخل کر دیئے گئے۔ حضرت عمرؓ نے خالدؓ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ خالدؓ! واللہ تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر تمام عمالان ملکی کو لکھ بھیجا کہ میں نے خالدؓ کو ناراضی سے یا خیانت کی بناء پر موقوف نہیں کیا لیکن چونکہ میں یہ دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کا معزول کرنا مناسب سمجھا تا کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔[2]

مسلمانوں کی علمی فتوحات

قرونِ وسطیٰ کے مسلمان سائنسدانوں میں ابنِ سینا، الکندی، نصیر الدین طوسی اور ملا صدرا کی خدمات طبیعیات کے شعبے میں بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ ان علماء نے اس میدان میں ابتدائی طور پر ایسی تحقیقات کیں جنہوں نے طبیعیات کو نئے افق پر پہنچایا۔ اس کے بعد، محمد بن زکریا رازی، البیرونی اور ابو البرکات البغدادی نے اس علم کو مزید ترقی دی اور اس کے دائرے کو وسیع کیا۔

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۶۱

[2] شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۲۳۱ تا ۲۳۳

الرازی نے علمِ تخلیقیات (cosmology) کو خاص طور پر فروغ دیا، اور ان کی تحقیق نے کائنات کی تخلیق اور ساخت کے بارے میں نئے نظریات پیش کیے۔ البیرونی نے نہ صرف ارسطو کے کئی طبیعیاتی نظریات کو چیلنج کیا، بلکہ انہوں نے ان نظریات کی سائنسی بنیادوں کو نئے انداز میں پرکھا۔ البیرونی کی تحقیقات نے طبیعیات اور فلکیات میں نئے اصولوں کی نشاندہی کی اور یہ جدید سائنسی سوچ کی طرف ایک اہم قدم تھا۔[1]

اس حوالے سے ول ڈیورانٹ (Will Durant) نے البیرونی کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "البیرونی نے وہ علمی راستے متعین کیے جن پر مغربی دنیا بعد میں چل کر طبیعیات اور فلسفہ میں انقلابی تبدیلیاں لے کر آئی۔" ان کی تحقیقات نے صرف مسلمانوں کی علمی دنیا کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ مغرب میں بھی ان کی سائنسی سوچ نے اہم کردار ادا کیا۔ ول ڈیورانٹ کے مطابق:

> Abu al-Rayhan Muhammad ibn Ahmad al-Biruni (973-1048) shows the Moslem scholar at his best. Philosopher, historian, traveler, geographer, linguist, mathematician, astronomer, poet, and physicist--and doing major and original work in all these fields--he was at least the Leibniz,25 almost the Leonardo, of Islam.[2]

"ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی بہترین مسلمان عالم تھے۔ وہ فلسفی، مورخ، سیاح، ماہر جغرافیہ، ماہر لسانیات، ریاضی دان، ماہر فلکیات، شاعر اور ماہر طبیعات تھے۔ انہوں نے ان تمام میدانوں میں نمایاں اور بنیادی و اصلی تحقیقات کیں۔ وہ اسلام کے لائبنز اور لیونارڈو تھے۔"

ابو البرکات البغدادی کی تحقیقات اور علمی کوششیں قدیم طبیعیات (Physics) میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ خاص طور پر حرکت (motion) اور سمتی رفتار (velocity) کے حوالے سے البغدادی اور ملا صدرا کے نظریات اور تحقیقات آج کے جدید سائنسدانوں

---

1 Shloms Biderman & Ben-Ami Scharfstein, *Rationality in Question: On Eastern and Western Views of Rationality*, p-101; John F, Haught, *Science and Religion*, p. 47.

2 Will Durant, *The Age of Faith*, Simon and Schuster, New York, 1950, p-243.

کے لیے بھی باعثِ حیرت ہیں۔ ابن الہیثم نے علمِ طبیعیات کے دائرے کو بہت وسعت دی اور کثافت (density)، ماحول (atmosphere)، پیمائش (measurements)، وزن (weight)، مکان (space)، زمان (time)، رفتار حرکت (velocities)، تجاذب (gravitation) اور کیپلیری عمل (capillary action) جیسے اہم موضوعات پر تحقیق کر کے ان موضوعات کو سائنسی طور پر سمجھنے کے لیے بنیادی مواد فراہم کیا۔ ان کی تحقیق نے طبیعیات کے میدان میں اہم سنگ میل قائم کیا۔

اسی طرح، mechanics اور dynamics کے شعبے میں بھی ابن سینا اور ملا صدرا نے نمایاں خدمات پیش کیں۔ ابن الہیثم کی معروف کتاب کتاب المناظر (The Book of Optics) نے اس میدان میں گراں قدر علم کا اضافہ کیا اور بصریات کے حوالے سے ایک نیا زاویہ نظر پیش کیا۔ ان کی تحقیق نے نظریاتِ روشنی اور بصارت کو سمجھنے میں سائنسی ترقی کی راہ ہموار کی۔

ابن باجّہ (Avempace) نے بھی dynamics میں اہم علمی خدمات انجام دیں اور ارسطو کے نظریۂ حرکت کو رد کر کے ایک نیا سائنسی تصور پیش کیا۔ اسی طرح، ابن رشد نے بھی طبیعیات کے علم میں اہم ترقی کی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو مزید سمجھنے میں مدد فراہم کی۔ ان مسلم سائنسدانوں نے گیلیلیو سے بھی پہلے کششِ ثقل (gravitational force) کے تصور کو دریافت کیا تھا، اگرچہ ان کا تصور آج کے جدید سائنسی تصورات سے مختلف تھا۔ ان کے نظریات نے اس میدان میں اہم بنیاد فراہم کی اور مغربی دنیا میں سائنسی انکشافات کے دروازے کھولے۔

اسی طرح، momentum کا تصور بھی اسلامی سائنس کے ذریعے مغربی دنیا میں متعارف ہوا۔ ثابت بن قراء نے lever کے اصول پر پوری کتاب لکھی، جسے مغربی تاریخ میں Liber Karatonis کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بغداد کے دیگر مسلم سائنسدانوں نے بھی تاریخ کے مختلف میکانکی آلات پر گہری سائنسی تحقیق کی اور ان آلات کے استعمال اور اصولوں کو بہتر سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ تمام مسلم سائنسدان نہ صرف اپنی فیلڈز میں

پیشرو تھے بلکہ ان کی تحقیقات نے نہ صرف اسلامی دنیا کو ترقی دی بلکہ مغربی دنیا کے سائنسی انقلاب کی بنیاد بھی رکھی۔ ان کی تحقیق اور انکشافات نے سائنس اور طبیعیات کے میدان میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، جو آج بھی سائنسی دنیا کی ترقی کا ایک اہم حصہ ہے۔

علمِ بصریات (Optics) کے میدان میں اسلامی سائنسی تاریخ کو غیر معمولی عظمت حاصل ہے۔ اس شعبے میں چوتھی صدی ہجری کے مشہور مسلم سائنسدان ابن الہیثم اور کمال الدین الفارسی کی سائنسی خدمات نے پچھلے نامور سائنسدانوں کے علم کی روشنی کو ماند کر دیا۔ ان کی تحقیق نے نہ صرف بصریات کے علم کو نیا رُخ دیا بلکہ اس میدان میں سائنسی ترقی کی بنیادیں بھی استوار کیں۔ ابن الہیثم کی مشہور کتاب *On Optics* آج بھی اپنے لاطینی ترجمے کے ذریعے زندہ ہے اور اس کتاب کا یورپ کی علمی ترقی میں اہم کردار رہا ہے۔ ابن الہیثم نے تاریخ میں پہلی بار عدسوں (lenses) کی تکبیری طاقت (magnifying power) کو دریافت کیا، جو کہ مکبر عدسے (magnifying lenses) کے نظریہ کو حقیقت کے قریب لے آیا۔ ان کی اس تحقیق نے بصریات کے علم میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی، جس نے انسان کو نئے طریقے سے بصارت کو سمجھنے کا موقع دیا۔

ابن الہیثم نے یونانی نظریہ بصارت (nature of vision) کو رد کر کے دنیا کو جدید نظریہ بصارت سے آشنا کیا اور ثابت کیا کہ روشنی کی شعاعیں (rays) آنکھوں سے پیدا نہیں ہوتیں، بلکہ یہ بیرونی اجسام (external objects) کی طرف سے آتی ہیں۔ ان کی تحقیق نے پردۂ بصارت (retina) کی حقیقت کو بھی واضح کیا اور اس کے بصری اعصاب (optic nerves) اور دماغ (brain) کے ساتھ تعلق کو تفصیل سے بیان کیا۔ ابن الہیثم نے بصریات کے میدان میں اس قدر تحقیقی پیش رفت کی کہ یورپ کے عظیم سائنسدان ایوکلیڈ (Euclid) اور کیپلر (Kepler) کے درمیان ان کی طرح کوئی اور شخصیت تاریخ میں پیدا نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن الہیثم جدید بصریات (optics) کے بانی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

ان کی تحقیقات نے نہ صرف قدیم سائنسدانوں جیسے روجر بیکن (Roger Bacon)، وٹیلو (Witelo)، اور پیکہم (Peckham) کو متاثر کیا بلکہ ان کا کام جدید دور میں کیپلر (Kepler) اور نیوٹن (Newton) کے تحقیقی کام کا سنگ بنیاد بھی بنا۔ ابن الہیثم کا نام روشنی، رفتار (velocities) ، عدسے (lenses) ، فلکی مشاہدات (astronomical observations)، موسمیات (meteorology) ، اور کیمرہ (camera) جیسے اہم موضوعات میں تاسیسی شان کا حامل ہے۔ اسی طرح، قطب الدین شیرازی اور القزوینی جیسے عظیم سائنسدانوں نے بھی بصریات کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور اس علم کے دائرے کو مزید وسیع کیا۔ ان مسلم سائنسدانوں کی تحقیق نے نہ صرف اسلامی دنیا کو علمی ترقی کے نئے افق سے آشنا کیا بلکہ دنیا بھر کے سائنسدانوں کو بھی جدید سائنسی خیالات کی طرف رہنمائی فراہم کی۔

علم النباتات (Botany) کے شعبے میں مسلمانوں نے نمایاں تحقیقی کام کیا اور اس علم کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ اس ضمن میں الدینوری کی چھ جلدوں پر مشتمل کتاب کتابُ النبات ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب سائنسی دنیا میں سب سے پہلا جامع اور ضخیم انسائیکلوپیڈیا ہے، جس نے نباتات کے متعلق ایک مکمل اور تفصیلی علم فراہم کیا۔ کتابُ النبات نہ صرف نباتات کی شناخت، درختوں، پودوں اور ان کے مختلف اقسام کی تفصیلات فراہم کرتی ہے، بلکہ یہ اس وقت کی سائنس کا ایک عظیم ذخیرہ سمجھی جاتی ہے۔

یہ مجموعہ اُس دور میں تحریر کیا گیا جب یونانی کتب کا عربی میں ترجمہ بھی شروع نہیں ہوا تھا، یعنی یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں کے پاس دنیا کے دیگر علوم کی ابتدائی معلومات بھی کم تھیں۔ پھر بھی الدینوری نے اپنے علم و تحقیق سے نباتات کے میدان میں ایک عظیم کام کیا، جس نے سائنسی دنیا کو نئی روشنی فراہم کی۔ ان کی اس کتاب میں پودوں کے مختلف اقسام، ان کی افزائش، ساخت اور فوائد پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی، اور اس نے دنیا بھر کے سائنسدانوں کو نباتات کے مطالعے میں نئی راہ دکھائی۔

کتابُ النبات کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس میں نباتات کے تمام اہم پہلوؤں کو سائنسی اور منظم طریقے سے بیان کیا گیا تھا، جو نہ صرف اس وقت کے سائنسدانوں کے لیے فائدہ مند تھا بلکہ یہ علم بعد میں مغربی دنیا میں بھی منتقل ہوا۔ الدینوری کی اس کتاب کو آج بھی بطور ایک سائنسی محقق کے کام کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ نباتات کے علم کے حوالے سے مسلمانوں کی اہم اور اولین کاوشوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک علمی خزانہ تھی جس نے نہ صرف اسلامی دنیا میں بلکہ بعد میں یورپ میں بھی نباتات کے مطالعے اور تحقیق کے رجحانات کو فروغ دیا۔ اس کا اثر نہ صرف اُس وقت کے علم پر پڑا، بلکہ اس نے آنے والی نسلوں کے لیے نباتات کے سائنسی مطالعے کی راہ ہموار کی۔ ایک مغربی سائنسی مصنف لکھتا ہے:

> His (Abu Hanifa Ad-Dinawari) treatise entitled Kitab al-Nabat (book of Plants) which combines a philological, historical and botanical approach in its study of plants is marked by its thoroughness and the care taken in the description of each specimen ....the role of (this book) in the development of Arabic botany should not be underestimated.[1]

''ابو حنیفہ الدینوری کی تصنیف 'کتاب النبات' جو پودوں کے ناموں، تعارف، تاریخ اور نباتاتی پہلوؤں کی تفصیل پر مشتمل ہے ہر پودے کی جزئیات تک بیان کرنے میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔.... عرب علم النباتات کی ترقی میں اس کتاب کا کردار نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔''

پروفیسر آرنلڈ کے مطابق، دنیا بھر سے مسلمانوں کا مکہ اور مدینہ کی طرف حج اور زیارت کے لیے سفر کرنے کا عمل علم الحیاتیات (biological science) کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس سفر کے دوران مسلمانوں نے مختلف مقامات پر پودوں اور حیاتیاتی وسائل کے بارے میں معلومات حاصل کیں، جس سے علم کی وسعت میں اضافہ ہوا۔

---

1 Cyrus Abivardi, *Iranian Entomology*, p. 472.

الادریسی نے اندلس سے لے کر افریقہ تک کا سفر کیا اور اس دوران سینکڑوں پودوں کے بارے میں معلومات جمع کیں، جنہیں انہوں نے کتابوں میں مرتب کیا۔ اس علم نے نہ صرف اس وقت کی سائنسی دنیا کو فائدہ پہنچایا بلکہ ان کی تحریروں نے بعد میں آنے والے محققین کے لیے بھی ایک قیمتی ذخیرہ چھوڑا۔ اسی طرح، ابن العوام نے ۵۸۵ پودوں کی خصوصیات اور حالات پر مشتمل ایک مفصل کتاب مرتب کی، جس نے علم نباتات (botany) میں نئی راہیں کھولیں۔ ان کی تحقیق نے اس شعبے میں سائنسی ترقی کو تیز کیا اور انہیں علمِ نباتات کے میدان میں ایک اہم مقام دلایا۔ ان کی کاوشیں اس بات کا غماز ہیں کہ مسلمان سائنسدانوں نے نہ صرف مذہبی سفر بلکہ سائنسی تحقیق کے دوران بھی دنیا بھر میں اہم جغرافیائی اور حیاتیاتی معلومات جمع کیں، جس سے علم کے نئے افق کھلے۔ پروفیسر ہٹی (Philip K. Hitti) بیان کرتا ہے:

> In the field of natural history especially botany, pure and applied, as in that of astronomy and mathematics, the western Muslims (of Spain) enriched the world by their researches. They made accurate observations on the sexual difference (of various plants).[1]

"قدرتی تاریخ کے میدان میں خاص طور پر خالص یا اطلاقی علم نباتات میں فلکیات اور ریاضیات کی طرح اندلس کے مغربی مسلمانوں نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ سے دُنیا کو مستفید کیا۔ اِسی طرح مختلف پودوں میں پائے جانے والے جنسی اِختلاف کے بارے میں اُن (ابوعبد اللہ التمیمی اور ابوالقاسم العراقی) کی تحقیقات بھی علمُ النباتات کی تاریخ کا نادِر سرمایہ ہیں۔"

اسلامی سپین کے فرمانروا عبدالرحمن اوّل نے قرطبہ (Cordoba) میں ایک زرعی تحقیقاتی ادارہ "حدیقہ نباتاتِ طبیہ" قائم کیا، جس سے نہ صرف علم نباتات (botany) کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے مواقع فراہم ہوئے بلکہ علم طب (medical sciences) میں بھی نئی تحقیق کی راہیں کھلیں۔ اس ادارے میں کیے گئے تجربات نے اندلس کے ماہرین نباتات کو پودوں میں جنسی اختلاف کی موجودگی کی دریافت میں مدد فراہم کی۔ اس اہم دریافت میں جہاں "حدیقہ نباتاتِ طبیہ" کی تجرباتی تحقیق نے اہم کردار ادا کیا،

[1] Philip K. Hitti, The History of Arabs, p. 574.

وہیں اللہ کے فرمان سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الأَرْضُ وَمِنْ أَنفُسِهِمْ وَمِمَّا لا يَعْلَمُونَ[1] (پاک ہے وہ ذات جس نے سب چیزوں کے جوڑے پیدا کئے، ان چیزوں سے بھی جو زمین اگاتی ہے، اور خود ان کی جانوں سے بھی، اور ان چیزوں سے بھی جنہیں وہ نہیں جانتے) نے بھی انہیں بنیادی رہنمائی فراہم کی۔

اس دوران، عبداللہ بن عبدالعزیز بکری نے "کتاب اَعیان النبات والشجریات الاندلسیہ" کے نام سے اندلس کے درختوں اور پودوں کے خواص پر تفصیل سے تحقیق کی۔ اشبیلیہ کے ماہر نباتات ابن الرومیہ نے نہ صرف اندلس بلکہ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور ان علاقوں میں ملنے والے پودوں اور جڑی بوٹیوں پر خالص نباتی نقطہ نظر سے تحقیق کی۔ ان کے علاوہ، ابن البیطار، شریف ادریسی اور ابن بکلارش جیسے ماہرین بھی اندلس کے معروف علماء نباتات میں شامل تھے، جنہوں نے نباتات کے علم میں قابل ذکر اضافے کیے اور اس شعبے کو مزید ترقی دی

علم الطب (Medical Science) کے میدان میں اسلامی تاریخ ایک بے مثال مقام رکھتی ہے۔ اس شعبے میں الرازی، ابو القاسم الزہراوی، ابن سینا، ابن رشد اور الکندی جیسے عظیم سائنسدانوں کے نام سرِ فہرست ہیں۔ مسلمانوں نے علمِ طب کی بنیاد تجربات پر رکھی اور بیماریوں کی نوعیت کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ دوا کے اثرات کی عملی تحقیق کو ضروری سمجھا۔

اسلامی سائنسدانوں نے پہلی مرتبہ اس علم کو سائنسی تحقیق کے اصولوں پر استوار کیا، اور دوا تیار کرنے کے عمل میں محض نظریات کو نہیں بلکہ تجربات اور مشاہدات کو اہمیت دی۔ جابر بن حیان نے اس حوالے سے اہم کام کیا اور دواؤں کی تاثیر کے بارے میں جالینوس کے نظریے کو رد کرتے ہوئے دواؤں کے اثرات کو دقیق ریاضیاتی بنیادوں پر سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ جابر بن حیان نے نہ صرف جالینوس اور دیگر یونانی

---

[1] یٰس، ۳۶: ۳۶

طبیبوں کے نظریات پر تنقید کی بلکہ ان میں اصلاح بھی کی، جس سے طب کے شعبے میں ایک نیا زاویہ نظر پیدا ہوا۔

ان عظیم مسلم سائنسدانوں کی تحقیق نے نہ صرف طب کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں لائیں بلکہ سائنسی تحقیق کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی، جس کا اثر آج تک دنیا بھر کے طب کے علم پر محسوس کیا جاتا ہے۔ ان کی محنت اور تحقیق نے علم طب کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ اس کی بنیاد کو جدید سائنسی اصولوں کے مطابق استوار کر دیا۔

(۷)

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

۱۰۔ اسلاف کی میراث

علامہ اقبال کہہ رہے ہیں کہ آج مسلمانوں کے پاس اپنے آبا و اجداد کی قیمتی کتب اور علمی ذخائر موجود نہیں ہیں، جو کبھی ان کی فکری و علمی ترقی کا ستون تھے۔ یہ کتب اور ذخائر نہ صرف ان کی سائنسی، فلسفیانہ اور ادبی کامیابیوں کا راز تھیں، بلکہ ان کے ذریعے ہی مسلمانوں نے دنیا کو نئی روشنی اور علم کی جھلکیاں پیش کی تھیں۔ بدقسمتی سے، مسلمانوں نے اپنی نااہلی، بے تدبیری اور علمی بے توجہی کی وجہ سے اس عظیم ورثے کو ضائع کر دیا۔ نتیجتاً، یہ علمی ذخیرہ نہ صرف ان کی پسماندگی کا سبب بن گیا، بلکہ دنیا میں ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنے کی بنیادی وجہ بھی بن چکا ہے۔

جب تک مسلمان اپنے اس گم شدہ علمی ورثے کو دوبارہ حاصل نہیں کرتے اور علم کی اہمیت اور اس کی قدر کو نہیں سمجھتے، تب تک ان کی حالت میں تبدیلی کی کوئی توقع کرنا مشکل ہو گا۔ مسلمانوں کی پچھلی عظمت کی یادیں اور ان کے کارنامے ان کی ترقی کی ایک مثال بنے ہوئے ہیں، لیکن موجودہ دور میں ان کی بے توجہی اور جمود کی وجہ سے وہ اپنی اصل جگہ سے بہت پیچھے ہیں۔

حالانکہ مسلمانوں کے ان تاریخی کارناموں کی بدولت معروف مغربی تاریخ دان جارج سارٹن نے اپنی تصنیف مقدمہ تاریخ سائنس (*Introduction to the History of Science*) میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اسلام کے آغاز سے لے کر چودھویں صدی تک، ہر صدی کو کسی نہ کسی مسلمان سائنسدان سے موسوم کیا تھا۔ یہ بات اس بات کا غماز ہے کہ مسلمان

سائنسدانوں نے نہ صرف سائنسی میدان میں انقلابی کام کیا بلکہ انہوں نے علم کی مختلف شاخوں میں دنیا کو روشنی فراہم کی۔ ان کی تحقیق و جستجو نے نہ صرف اسلامی دنیا کو ترقی دی بلکہ مغرب میں بھی سائنسی سوچ کی بنیاد رکھی۔ آج مسلمان اگر اپنے علمی ورثے کو دوبارہ زندہ کریں اور اسے سراہیں، تو وہ اپنے عظیم ماضی کو واپس لا سکتے ہیں اور دنیا میں ایک مرتبہ پھر علم و حکمت کا مرکز بن سکتے ہیں۔ جارج سارٹن (George Sarton) نے اپنی تصنیف مقدمہ تاریخ سائنس (*Introduction to The History of Science*) میں آغاز اسلام سے چودھویں صدی تک ہر صدی کو کسی نہ کسی مسلمان سائنسدان سے درج ذیل تفصیل کے مطابق موسوم کیا ہے:

آٹھویں صدی کا دوسرا نصف	....	ابو موسیٰ جابر بن حیان
نویں صدی کا پہلا نصف	....	محمد بن موسیٰ الخوارزمی
نویں صدی کا دوسرا نصف	....	ابو بکر محمد بن زکریا الرازی
دسویں صدی کا پہلا نصف	....	ابوالحسن ابن علی المسعودی
دسویں صدی کا دوسرا نصف	....	ابوالوفا الجرجانی
گیارھویں صدی کا پہلا نصف	....	البیرونی
گیارھویں صدی کا دوسرا نصف	....	ابو الفتح عمر خیام
بارھویں صدی کا پہلا نصف	....	ابومروان ابن زبیر
بارھویں صدی کا دوسرا نصف	....	ابن رشد
تیرھویں صدی کا پہلا نصف	....	ابن بیطار
تیرھویں صدی کا دوسرا نصف	....	محمد بن مسعود الشیرازی
چودھویں صدی کا پہلا نصف	....	اسماعیل عماد الدین الایوبی
چودھویں صدی کا دوسرا نصف	....	عبدالرحمن ابن خلدون[1]

[1] حبیب احمد صدیقی، مسلمان اور سائنس کی تحقیق، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ص ۷۶

علامہ اقبال کے مطابق، آج کے مسلم نوجوان کے لیے یہ ایک سنگین لمحہ فکریہ ہے کہ وہ آج علم کے ہر میدان میں پیچھے رہ گیا ہے، حالانکہ اس کے آباواجداد علمن کے تمام شعبوں میں پیش پیش اور رہنمائی کرنے والے تھے۔ اس بات کا واضح مثال علمِ فقہ و قانون (Law & Jurisprudence) میں مسلمانوں کا بے مثال کردار ہے۔ اس حوالے سے امامِ اعظم ابو حنیفہؒ نے دُوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہی تاریخِ قانون میں ایسی قابلِ ذکر اصلاحات اور تخلیقات پیش کیں جو آج بھی علمِ قانون کے اہم ذخائر میں شمار کی جاتی ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں سے امام ابویوسفؒ اور امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے ان کی فرمودہ تصانیف کی بنیاد پر شریعت کے مختلف موضوعات پر چھ کتابیں مرتب کیں جن میں الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الکبیر، السیر الصغیر، المبسوط اور الزیادہ شامل ہیں۔ ان کتب میں اُنہوں نے Public International law اور Private International law جیسے اہم موضوعات پر تفصیل سے بحث کی۔ بعد ازاں، امام سرخسیؒ نے شرحُ السیر کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل شرح لکھی، جو اپنے وقت کے مغربی معیاروں سے کہیں بہتر تھی۔ امام سرخسیؒ کی کتاب المبسوط، جو تقریباً ایک ہزار سال پہلے تحریر کی گئی، علمِ قانون پر ایک نادر اور بے مثال مجموعہ ہے۔

یہ تمام کاوشیں اس بات کا غماز ہیں کہ اسلامی دنیا اُس دور میں قانون اور فقہ کے میدان میں ایسے اصول وضوابط فراہم کر رہی تھی جب باقی دنیا جہالت کی تاریکیوں میں غرق تھی۔ آج جب مغرب اپنی تاریخ کے اس دور کو "Dark Ages" کے طور پر یاد کرتا ہے، اس وقت اسلامی دنیا میں یہ دور علم و حکمت کی روشنی سے روشن تھا۔

امام ابو حنیفہؒ کی کتب ظاہر الروایہ، جو امام محمدؒ کے ذریعے مرتب کی گئیں، اور امام مالکؒ کی الموطا، امام شافعیؒ کی کتابُ الام اور دیگر ائمہ کی تصانیف نے فقہ و قانون کا ایک عظیم سرمایہ پیدا کیا۔ اس کے بعد فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی اور فقہ جعفریہ میں بھی بہت سی اہم کتابیں مرتب ہوئیں جیسے المبسوط، الہدایہ، فتح القدیر، المجموع، الوجیز، النھایہ، کتابُ المغنی اور اعلام الموقعین عن رب العالمین وغیرہ۔

اسی طرح، Fiscal & Taxation Law اور Administrative Law پر امام ابو یوسفؒ اور یحییٰ بن آدمؒ کی کتاب الخراج اور ابو عبید قاسم بن سلامؒ کی کتاب الاموال اوائل دور کے بہترین علمی شہ پارے ہیں۔ بین الاقوامی قانون پر امام زید بن علیؒ کی المجموع میں بھی مفصل بحث کی گئی، اور امام مالکؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ سمیت دیگر فقہاء نے اس موضوع پر اہم مواد فراہم کیا۔ اس کے علاوہ، Comparative Case Law پر بھی دوسری صدی ہجری میں کام شروع ہو چکا تھا، جو آج کے دور میں ایک اہم قانونی فن اور علمی موضوع ہے۔ دبوسی، ابنِ رشد، شاطبی اور سیموری کی تصانیف اس فن کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

یہ تمام تصانیف اور تحقیق اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اسلامی فقہ و قانون نے نہ صرف اپنی ترقی کے لحاظ سے بلکہ عالمی سطح پر انسانیت کی فلاح کے لیے بھی بے پناہ کام کیا۔ آج کے مسلمانوں کو اپنے آبا کے اس علمی ورثے کو سمجھنا اور اس پر فخر کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی پچھلی عظمت کو واپس حاصل کر سکیں۔

علمِ دستور (Constitutional Law) کے میدان میں دنیا کی سب سے پہلی باقاعدہ دستاویز خود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیار کردہ "میثاقِ مدینہ " (The Pact of Madina) ہے، جو ۳۶ دفعات (articles) پر مشتمل ہے۔ یہ آئینی و دستوری دستاویز ابنِ ہشامؒ، ابنِ اسحاقؒ، ابو عبیدؒ، ابنِ سعدؒ، ابنِ کثیرؒ اور ابنِ ابی خیثمہؒ جیسے عظیم محدثین کے ذریعے مکمل شکل میں ہم تک پہنچی۔ "میثاقِ مدینہ " ایک جامع اور تفصیلی آئین تھا جس نے ریاستِ مدینہ میں مختلف قبائل اور گروہوں کے درمیان معاشی، سماجی اور سیاسی عدل و مساوات قائم کرنے کی بنیاد رکھی۔ اس میں نہ صرف شہری حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا بلکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بھی وضاحت کی گئی تھی، اور اس نے معاشرتی ہم آہنگی کی راہ ہموار کی۔

یہ دستاویز انسانی تاریخ کا سب سے پہلا تحریری آئین (written constitution) ہے، جس سے قبل دنیا میں کسی باقاعدہ اور باضابطہ ریاستی دستور کے تحریر کیے جانے کی کوئی

مثال نہیں ملتی۔ اس آئینی دستاویز میں جو اصول وضع کیے گئے وہ نہ صرف اُس دور کی مخصوص ضروریات کے مطابق تھے بلکہ آج کے آئینوں کے اصولوں کی بنیاد بھی فراہم کرتے ہیں۔

مغربی دنیا میں آئینی و دستوری سفر کا آغاز ۱۲۱۵ء میں ہوا، جب شاہِ انگلستان، کنگ جان، نے مگنا کارٹا (Magna Carta) پر دستخط کیے، لیکن اس سے ۵۹۳ سال قبل، ۶۲۲ء میں، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریاستِ مدینہ میں ایک تحریری آئین تشکیل دیا تھا، جو معاشی و سماجی عدل اور مساوات پر مبنی تھا۔ یہ دستاویز اس لحاظ سے انوکھا تھا کہ اس میں تمام شہریوں کو یکساں حقوق دینے کی بات کی گئی، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

اس سے قبل، مختلف ریاستوں کے دستور اور قوانین میں صرف اخلاقی نصیحتیں اور تعلیمی مواد شامل تھا۔ مثلاً ہندوستان کے منوسمرتی (۵۰۰ق م)، آرتھ شاستر (۳۰۰ ق م)، اور ارسطو کی تصانیف میں بھی اصول وضوابط موجود تھے، مگر یہ سب درسی نوعیت کے کام تھے، جن میں ریاستی نظام چلانے کے بارے میں بادشاہوں کے لیے نصیحتیں دی گئی تھیں۔ ارسطو کا "شہر ایتھنز کا دستور" (Athenian Constitution)، جو ۱۸۱۹ء میں شائع ہوا، بھی اسی نوعیت کا تھا، جس میں ریاستی امور پر فکری رہنمائی فراہم کی گئی تھی۔ ان تصانیف کو کسی بھی سربراہِ ریاست یا حکومت نے باقاعدہ دستور کے طور پر نافذ نہیں کیا، اور نہ ہی یہ دستاویزات ریاستی قانون بنیں۔

یہ اعزاز سب سے پہلے "میثاقِ مدینہ" کو حاصل ہوا اور یہ ایک عظیم تاریخی حقیقت ہے جو سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درخشندہ باب ہے۔ اس دستاویز نے نہ صرف مسلمانوں کو ایک قانونی اور اخلاقی فریم ورک فراہم کیا بلکہ اس نے انسانیت کے لیے عدل، مساوات اور ہم آہنگی کی بنیاد بھی رکھی۔ "میثاقِ مدینہ" کی حیثیت نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ عالمی آئینی تاریخ میں بھی سنگ میل کی سی حیثیت رکھتی ہے، اور یہ آئین کی روحانی، سماجی اور قانونی اہمیت کا ایک عظیم نمونہ ہے۔[1]

---

[1] Margoliouth, D.S. , *Mohammed and the Rise of Islam*, p. 215, 216., Francesco Gabrieli, *Muhammad and the Conquests of Islam*, p. 21.

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانب سے دستوری و آئینی کام کے باقاعدہ آغاز کے بعد، اسلامی دنیا میں اس حوالے سے متعدد اہم کتابیں اور تحقیقی مجموعات مرتب کی گئیں۔ ان میں الماوردیؒ اور ابو علیؒ کی الاحکام السلطانیہ، غزالیؒ کی نصیحۃُ الملوک، طرطوسیؒ کی سراجالملوک اور الفارابیؒ کی المدینہ الفاضلہ جیسے درسی کتب شامل ہیں، جنہوں نے اسلامی دستوریات اور حکومتی اصولوں کو واضح کیا۔ ان تصانیف نے مسلمانوں کو نہ صرف حکومتی نظام کے بارے میں رہنمائی فراہم کی بلکہ ایک عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کے درمیان فرق کو بھی واضح کیا۔

مسلمانوں کی دستوری و آئینی خدمات میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ریاست کے تین اہم شعبوں: مقننہ (legislature) ، انتظامیہ (executive) اور عدلیہ (judiciary) کو علیحدہ علیحدہ پہچان دی۔ یہ مفاہمت عہدِ خلافتِ راشدہ میں ہی کی جاچکی تھی، جہاں 'اہل الحل والعقد'، 'اولی الامر' اور 'القضا' کے مستقل عہدے متعارف کرائے گئے اور ان کے دائرہ کار بھی واضح طور پر متعین کیے گئے۔ اس کے برعکس مغربی دنیا میں ان تصورات کا فروغ بہت بعد میں ہوا۔ Common Law پر بھی اسلامی دنیا میں دوسری صدی ہجری کے اوائل میں فقہی و قانونی مجموعات (juristic & legal codes) مرتب ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ان مجموعات کو مختلف حصوں اور ابواب (parts & chapters) میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ عبادات (religious laws) ، مناکحات (family laws) ، معاملات و معاہدات (civil & contractual laws) ، عقوبات (penal laws) ، مالیات (fiscal laws) اور قضا و شہادات (procedural & evidence laws) جیسے شعبوں میں قانونی تقسیم بھی تاریخِ اسلام کی پہلی صدی میں ہی کی جاچکی تھی۔ یہ وہ علم و حکمت تھی جو مسلمانوں کو قرآنِ مجید کی تعلیمات اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنتِ مبارکہ کے ذریعے حاصل ہوئی تھی، جبکہ اُس وقت مغربی دنیا بنیادی حقوقِ انسانی اور علم و آگہی سے بالکل محروم تھی۔

مسلمانوں کی علمِ میقات (timekeeping) میں خصوصی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ اس علم کا تعلق براہِ راست نمازوں اور روزوں کے معاملات سے تھا۔ البتانی (۸۷۷ء-۸۱۸ء) اور البیرونی (۹۷۳ء-۱۰۵۰ء) جیسے ماہرین کا دور تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تھا، اور انہی کے ذریعے اس علم میں نمایاں ترقی ہوئی۔ پنج وقتی نمازوں کے اوقات کے تعین کے لیے ہر طول و عرضِ بلد پر مقامی ماہرینِ تقویم و فلکیات نے علیحدہ علیحدہ کیلنڈرز وضع کیے۔ رمضان المبارک کے روزوں کے لیے طلوع و غروبِ آفتاب کے اوقات کے تعین کے لیے خصوصی تقویمات تیار کی گئیں، جس سے ہر طول بلد پر واقع شہروں کے لیے مختلف کیلنڈرز اور پھر مشترکہ تقویمات کو فروغ ملا۔ اس کے بعد تیرہویں صدی عیسوی میں باقاعدہ طور پر مؤقّت کا عہدہ وجود میں آیا، جو ایک پیشہ ور ماہرِ فلکیات ہوتا تھا۔

۱۳۳۱ء میں چین کا سرکاری نقشہ بھی مسلم جغرافیہ دانوں نے تیار کیا تھا۔[1] مسلمان ماہرین فلکیات نے مختلف آلات خود ایجاد کیے، جن میں حامد بن الخضر الخجندی کا آلۃ السدس الفخری شامل ہے، جسے میل اعظم (Greatest Obliquity of the Ecliptic) کی پیمائش کے لیے استعمال کیا گیا اور جو ۴۰ میٹر بلند تھا۔ مغرب میں استعمال ہونے والا almanac بھی عربی زبان سے ماخوذ ہے، جس کی عربی اصل المناخ) موسم) ہے۔ یہ نظام بھی مسلم سائنسدانوں کی اختراع تھا۔

شیخ عبد الرحمن الصوفیؒ نے اس موضوع پر ایک عظیم کتاب صورُ الکواکب (Figures of the Stars) تصنیف کی تھی، جو جدید علمِ فلکیات کی بنیاد بنی۔ اس کے علاوہ، ابن الہیثم کی خدمات بھی اس میدان میں ناقابلِ فراموش ہیں، جنہیں مغرب میں Alhazen کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی تحقیق نے فلکیات کی دنیا میں ایک نیا موڑ دیا اور ان کے کام کی بدولت کئی سائنسی اصول وضع ہوئے۔[2] مسلمان سائنسدانوں کی ان بے مثال خدمات نے نہ صرف اسلامی دنیا کو سائنسی و فنی لحاظ سے ترقی دی بلکہ دنیا بھر کے سائنسی، فلکیاتی، اور قانون کے میدانوں میں ان کا اثر آج بھی محسوس کیا جاتا ہے۔

---

1 Validi, Ahmet Zaki, "Islam and the Science of Geography", Translated by Pickthal, *Islamic Culture*, vol 8: p.514, Oct. 1934.

2 Will Durant, *The Age of Faith*, pp. 288, 1138, 1161.

علمِ ہیئت و فلکیات (astronomy) اور علمِ نجوم (astrology) کے میدان میں اندلسی مسلم سائنسدانوں کی خدمات نہ صرف ان کے عہد میں اہمیت کی حامل تھیں بلکہ ان کا اثر آج تک سائنسی دنیا میں محسوس کیا جاتا ہے۔ اگرچہ "علی بن خلاف اندلسی" اور "مظفر الدین طوسی" جیسے عظیم نام اس شعبے میں نمایاں ہیں، لیکن ان سے بھی بہت پہلے، تیسری صدی ہجری میں قرطبہ (Cordoba) کے معروف سائنسدان عباس بن فرناس نے اپنی تحقیقات اور اختراعات سے تاریخ میں سنگ میل قائم کیا۔ عباس بن فرناس نے اپنے گھر میں ایک کمرہ تیار کیا تھا، جو جدید سیارہ گاہ (planetarium) کی بنیاد سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کمرے میں نہ صرف ستاروں، بادلوں، اور بجلی کی گرج چمک جیسے مظاہرِ فطرت کا مشاہدہ ممکن تھا، بلکہ یہ ایک سائنسی نقطہ نظر سے بھی اہمیت رکھتا تھا، جہاں پر وہ مختلف فلکیاتی مشاہدات کرتے تھے۔ عباس بن فرناس کو اس لیے بھی یاد کیا جاتا ہے کیونکہ وہ تاریخ میں وہ عظیم سائنسدان تھے جنہوں نے دنیا کا سب سے پہلا ہوائی جہاز بنایا اور اُڑایا۔[1] ان کی یہ کوشش نہ صرف فلکیات کے علم میں انقلابی تھی بلکہ انسانی تاریخ میں فلک پر پرواز کرنے کی پہلی کامیاب کوشش تھی۔

اس کے بعد البیرونی اور ازرقیل جیسے سائنسدانوں نے equatorial instruments کو وضع کیا اور ان میں مزید ترقی کی۔ اسی طرح، مسلمانوں نے سمتِ قبلہ کے درست تعین کے لیے بھی سائنسی اصول وضع کیے اور چاند و سورج کے گرہن (lunar & solar eclipses) کو پیش گوئی کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ یہ ساری تحقیق اور سائنسی اقدامات عباس بن فرناس اور ان کے بعد کے مسلم سائنسدانوں کے عزم و محنت کا نتیجہ تھے۔

البطانی، ابنِ یونس اور ازرقیل (Arzachel) جیسے مسلم سائنسدانوں نے Toledan Astronomical Tables مرتب کیے،[2] جنہوں نے چاند کی گردش اور دیگر فلکیاتی مظاہر کے بارے میں نہ صرف تفصیل سے حساب کتاب کیا بلکہ ان کی سائنس

---

1 *The Encyclopedia of Islam*, A. J. Brill, Leiden, 1965, vol. I, p.11.

2 David Pingree, Alison Salvesen, Henrietta McCall, *The Legacy of Mesopotamia*, p. 135.

میں ٹھوس بنیاد رکھی۔[1] ان سائنسی تحقیقوں نے فلکیات کے علم کو نئے زاویے فراہم کیے اور ان کی بدولت مسلمانوں نے دنیا کے سامنے سائنسی دریافتوں کا ایک نیا باب کھولا۔

اس تمام تحقیق اور سائنس کے بارے میں بعض غیر مسلم مورخین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں نے اس میدان میں غیر معمولی ترقی کی تھی اور ان کی سائنسی تحقیق نے مغرب کے سائنسی انقلاب میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ بات ان سائنسی خدمات کی عظمت کو ثابت کرتی ہے جو مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں فراہم کیں، اور اس کی بدولت فلکیات، ریاضی، اور دیگر سائنسی شعبوں میں ان کی رہنمائی کی روشنی آج بھی ہم پر قائم ہے۔ مورخین کے مطابق:

> Muslim astrologers also discovered (around the thirteenth century) the system for giving the ephemerids of the sun and the moon --- later extended to the other planets --- as a function of concrete annual dates. Such was the origin of the almanacs which were to be so widely used when trans-oceanic navigation began.[2]

"مسلمان ماہرینِ فلکیات نے بھی (تیرہویں صدی عیسوی کے قریب) چاند اور سورج کو حرکت دینے والے نظام کو دریافت کیا اور بعد ازاں دُوسرے سیاروں کے حوالے سے تحقیق شروع کی .... طے شدہ سالانہ تاریخوں کے حساب سے۔ اس طرح المانکس کی ابتداء ہوئی جو سمندر کو پار کرنے والے جہازوں کی رہنمائی کے لئے بکثرت استعمال کیے جاتے تھے۔"

مغرب کا علم الفلکیات مسلمانوں کی علمی خدمات کا مرہونِ منت ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں مسلم سائنسدانوں جیسے بتانی، فرغانی اور خوارزمی کی فلکیات پر تصانیف کے تراجم مغربی دنیا میں شائع ہوئے۔ ان تصانیف کے ذریعے مغرب کو فلکیات میں نئے افق دیکھنے کو

---

1 Jose Chabas, B.R. Goldstein, *The Alfansine Tables of Toledo (Archimedes – New Studies in the History and Philosophy of Scenic and Technology)*, pp. 139, 140., Robert L, Benson, Giles Constable, Carol D. Lanham, *Renaissance and Renewal in the Twelfth Century*, p. 479; Donald Hill, *A History of Engineering in Classical and Medieval Times*, p. 197.

2 Schacht J. and Bosworth C.E., *The Legacy of Islam*, pp. 474-482.

ملے۔ ایک انگریز فلکیاتدان، Guillaume نے الزرقالی کی مشہور تصنیف زیج طلیطلہ (طلیطلہ کی جنتری) میں تبدیلیاں کیں اور اسے لندن کے حالات کے مطابق ڈھال دیا، جسے بعد میں لندن کی جنتری کے طور پر جانا گیا۔ یہ جنتری ایک طویل عرصے تک مغرب میں فلکی حسابات کے لیے اہم بنیاد کے طور پر استعمال ہوتی رہی، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی سائنسی ترقی نے مغربی دنیا کے علمی ارتقاء پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

علم الکیمیا (Chemistry) کے میدان میں بھی مسلمانوں کا کردار بے مثال ہے۔ اسلامی تاریخ میں علمِ کیمسٹری کے باب میں خالد بن یزیدؓ (۷۰۴ء) اور امام جعفر الصادقؒ (۷۶۵ء) کی شخصیات کو بنیاد ساز اور موسس کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ نامور مسلم سائنسدان جابر بن حیان (۷۷۶ء) نے کیمسٹری کی دنیا میں اپنی تحقیقات سے گہرے نقوش چھوڑے۔ جابر بن حیان امام جعفر الصادقؒ کے شاگرد تھے، اور انہوں نے کیمسٹری کو مفروضات و تصورات کی بجائے تجربات اور تجزیات کی بنیاد پر فروغ دیا، جس سے قدیم الکیمی (alchemy) کو باقاعدہ سائنس میں تبدیل کر دیا۔ وہ تبخیر (evaporation) ، تصعید (sublimation) اور قلم سازی (crystallization) جیسے طریقوں کے موجد تھے۔ ان کی کتابیں یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طویل عرصے تک نصاب کا حصہ رہیں۔

جابر بن حیان کی سائنسی تصانیف کو The Jabirean Corpus کے نام سے جانا جاتا ہے، جن میں کتابُ السبعین (The Seventy Books) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جابر بن حیان نے کیمیائی عوامل میں موجود نسبتوں کا قانون (Law of Proportion) دریافت کیا اور اسے اپنی تصنیف کتابُ المیزان (The Book of Balance) میں بیان کیا۔ ان کے علاوہ، ابو مشعر، سہروردی، ابنِ عربی، اور الکاشانی جیسے عظیم مسلم ماہرین کا کام بھی کیمسٹری کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان کی سائنسی تحقیقات اور تصانیف عربی سے لاطینی اور پھر انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہو کر مغربی دنیا تک پہنچیں، جس سے نہ صرف مسلم سائنسدانوں کے نام تبدیل ہوئے بلکہ ان کی خدمات کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔ جیسے الرازی کو Rhazes، ابن بیطار کو Aben Bethar، ابن سینا کو

Avicenna، ابو القاسم کو Abucasis، ابن الہیثم کو Alhazen، ابن باجہ کو Avempace اور ابن زہر کو Avenzoar کے نام سے جانا گیا۔ اس کے نتیجے میں، عربی اصطلاحات بھی تراجم کے ذریعے مغربی دنیا میں تبدیل ہو گئیں، اور آج جب کوئی مسلمان یا مغربی سائنسدان ان ناموں اور اصطلاحات کو پڑھتا ہے تو انہیں اسلامی تاریخ کے حصہ ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا، حالانکہ یہ تمام نام عربی الاصل ہیں۔

مغربی اہلِ علم پر مسلمانوں کے اثرات بہت واضح ہیں۔ مغربی مفکر Julius Ruska نے رازی کو کیمیائے تجربی (Experimental & Applied Chemistry) کا بانی قرار دیا۔ رازی اور ابن سینا کی علمی کاوشوں سے براہ راست متاثر ہونے والے مغربی سائنسدانوں میں Albertus ،Roger Bacon ،Thomas Von Aquin Magnus اور Raymundus Lullus شامل ہیں۔ ان مغربی مفکرین نے اسلامی سائنسدانوں کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے سائنسی اصولوں کو مزید مستحکم کیا، اور اس طرح مسلمانوں کی سائنسی خدمات نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ مغرب میں بھی علم و تحقیق کی بنیاد بنی۔

علمِ تاریخ اور عمرانیات (Historiography & Sociology) کے میدان میں بھی اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بے شمار گرانقدر تحقیق اور سرمایہ جمع کیا گیا، جس نے نہ صرف سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مستند طور پر مرتب کیا بلکہ دس ہزار سے زائد صحابہ کرام کے حالات و سوانح کو بھی تفصیل سے جمع کر کے ان کی زندگیاں علمی تحقیق کا حصہ بنائیں۔ تاریخِ اسلام میں اس علم کو "اَسماء الرجال" کے نام سے جانا جاتا ہے، جس میں محققین نے پانچ لاکھ سے زیادہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور دیگر رواۃِ حدیث کے حالاتِ حیات کو ترتیب دیا۔ یہ فن اپنی نوعیت میں منفرد ہے، جو دنیا کی کسی بھی قوم یا مذہب میں نہیں ملتا۔

ابنِ اسحاقؒ، جو عہدِ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک کی تاریخ مرتب کرنے والے عظیم مورخین میں سے ہیں، اس علم کے اولین

بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تصانیف نے اسلامی تاریخ کو ایک تسلسل کے ساتھ متعارف کرایا، جس سے تاریخ نویسی کا ایک نیا باب روشن ہوا۔ اسی طرح ابنِ ہشامؒ، طبریؒ، مسعودیؒ، مسکویہ حلبیؒ، اندلسیؒ، ابنِ خلدونؒ، دیار بکریؒ، یعقوبیؒ، بلاذریؒ، ابنِ اثیرؒ، ابنِ کثیرؒ، سہیلیؒ، اور ابنِ سیدُالناسؒ جیسے عظیم تاریخ دانوں کے کام بھی بے حد اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے ذریعے اسلامی تاریخ کو ایک مستند اور تفصیلی شکل دی گئی۔ سیاسی فکر (Political Thought) اور عمرانیات (Sociology) میں بھی مسلمانوں کا حصہ بے مثال ہے۔ غزالیؒ، فارابیؒ، ماوردیؒ، ابنِ خلدونؒ، ابنِ رشدؒ، ابنِ تیمیہؒ، ابنُ القیمؒ اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کی تصانیف اور نظریات نے اس میدان میں ایک انقلابی کردار ادا کیا۔ ان شخصیات نے معاشرتی، سیاسی اور سماجی مسائل پر گہرے خیالات پیش کیے جو آج بھی فکری دنیا میں اہمیت رکھتے ہیں۔

فنِ تاریخ میں ابنِ خلدون کا مقدمہ تاریخ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں اس نے تاریخ کی نفسیاتی، سماجی، معاشرتی، اور اقتصادی تشریح کی۔ ابنِ خلدون کی مقدمہ میں پیش کی جانے والی عصبیہ (asabiyyah) یعنی قوموں کی اجتماعی قوت، قوموں کی طبعی عمر، اور اقوام کے عروج وزوال کے متعلق نادر خیالات نے تاریخ کے فہم کو نئی سمت دی۔ اس نے تاریخ کو صرف سیاسی واقعات کی ایک صفحہ داری نہیں سمجھا بلکہ اسے ایک علمی اور سماجی پس منظر میں پیش کیا، جس میں انسانوں کے تعلقات، ان کی معاشرتی ساخت، اور ان کے معاشی حالات کو مدنظر رکھا گیا۔ ابنِ خلدون کا یہ مقدمہ تاریخ انسانی میں لکھی جانے والی چند عظیم ترین علمی کاوشوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس نے نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ عالمی تاریخ میں گہرے اثرات مرتب کیے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف علمی تاریخ اور معاشرتی علوم میں اہم کام کیا بلکہ ان کی علمی وراثت نے دنیا بھر کی فکری اور سائنسی پیشرفت میں اہم کردار ادا کیا، جو آج بھی ہمیں ان کی تحقیق اور تصانیف کے ذریعے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ٹائن بی (Arnold J. Toynbee) نے مقدمہ ابن خلدون پر تبصرہ لکھتے ہوئے لکھا:

> He (Ibn Khaldun) has conceived and formulated a philosophy of history which is undoubtedly the greatest work of its kind that has ever yet been created by any mind in any time or place.[1]

"ابن خلدون نے تاریخ کا ایسا فلسفہ تخلیق کیا اور اسے واضح طور پر بیان بھی کیا جو بلاشبہ آج تک کسی بھی زمانے یا ملک میں کسی بھی ذہن کا تخلیق کردہ اپنی نوعیت کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔"

برنرڈ لیوس (Bernard Lewis) نے ابن خلدون کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

> The greatest historian of the Arabs and Perhaps the greatest historical thinker of the Middle Ages.[2]

"ابن خلدون عربوں بلکہ قرونِ وسطی کا عظیم ترین مفکرِ تاریخ ہے۔"

علمِ جغرافیہ اور مواصلات (Geography & Communications) کے میدان میں بھی اسلامی عہد کے عروج کے دوران زبردست ترقی ہوئی۔ اس عرصے میں مسلمانوں نے نہ صرف جغرافیائی معلومات کو جمع کیا بلکہ اس علم کو منظم اور جدید خطوط پر استوار کیا۔ بلاذریؒ اور ابنِ جوزیؒ بیان کرتے ہیں کہ عہدِ فاروقی میں خلافتِ اسلامیہ کی ڈاک کا نظام اتنا مستحکم اور وسیع تھا کہ یہ ہر وقت ترکستان (Central Asia) سے لے کر مصر (Egypt) تک کے علاقوں میں روانہ ہوتی تھی۔ جغرافیہ (geography) اور نقشہ سازی (topography) کے ماہرین ان ڈاکوں کے ساتھ دورانِ سفر مختلف علاقوں کے تفصیلی نقشے تیار کرتے تھے اور ان میں تمام متعلقہ مقامات کی جغرافیائی، تاریخی اور اقتصادی معلومات فراہم کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان معلومات کو خاص طور پر حروفِ تہجی کی ترتیب (alphabetic order) میں مرتب کیا جاتا تاکہ ان کا فائدہ آسانی سے حاصل کیا جاسکے۔

اوائل دورِ اسلام میں 'ابنِ حوقل' نے بھی کرہ ارض کے نقشے تیار کیے اور نقشہ سازی کے فن پر تحقیق کی۔ اپنے بنائے ہوئے نقشوں میں اُس نے زمین کو کرہ نما (circular

---

1 A. J. Toynbee, *A Study of History*, Oxford University Press, London, 1956, v.III, p.322.

2 Bernard Lewis, *The Arabs in History*, p. 160.

(shape) دکھایا اور بحیرۂ روم (Mediterranean Sea) کی حدود کی درست شناخت فراہم کی۔ ابنِ حوقل کا یہ کام نہ صرف اس دور کی جغرافیائی فہم کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوا بلکہ نقشہ سازی کے فن میں ایک نئی جہت کو متعارف کرایا۔ اسی طرح، 'الادریسی' کا نقشہ جو شاہِ سسلی (۱۰۱۱-۱۱۵۴ء) کے لیے تقریباً نو سو سال قبل تیار کیا گیا تھا، اس میں دنیائے عالم کے طویل ترین دریا، دریائے نیل (Nile) کے ماخذ تک کی تفصیلات فراہم کی گئیں۔ الادریسی نے دریائے نیل کے ڈیلٹا سے ۶۶۷۰ کلو میٹر دور اس کے اصلی ماخذ کا درست تعین کیا، جو اُس دور کی جغرافیائی تحقیق کی ایک نمایاں کامیابی تھی۔

یاقوت حمویؒ نے جغرافیہ پر اپنی اہم تصنیف معجمُ البلدان (Dictionary of Countries) مرتب کی، جو اُس وقت کی سب سے بڑی جغرافیائی معجم تھی۔ اس کتاب نے دنیا کے تمام بڑے شہروں اور قصبوں کی تفصیلات کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے پیش کیا، جس سے اہلِ علم کو دنیا کے جغرافیائی حقائق کا علم ہوا۔ یہ معجم اس دور کی جغرافیائی علم کی عکاسی کرتی ہے اور اس نے عالمی سطح پر جغرافیائی تحقیق کے معیار کو بہتر بنایا۔ خوارزمی نے صورۃُ الارض (Image of the Earth) کے نام سے ایک اہم جغرافیائی مطالعہ پیش کیا، جس نے بعد میں جدید جغرافیہ کی بنیاد رکھی۔ اس کام نے زمین کی ساخت اور اس کے مختلف حصوں کے تعلقات کو نئے انداز میں پیش کیا اور جغرافیائی علم کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا۔

حمدانی (۹۴۵ء) نے چوتھی صدی ہجری میں علمِ جغرافیہ میں انتہائی گرانقدر معلومات کا اضافہ کیا۔ ان کی تحقیق اور کام نے جغرافیائی علم کو نئے افق تک پہنچایا اور اس علم کی اہمیت کو تسلیم کروایا۔

اس طرح، مسلمانوں کی جغرافیائی تحقیقات اور نقشہ سازی کے فن نے نہ صرف اسلامی دنیا میں بلکہ عالمی سطح پر بھی جغرافیائی علم کو نئے افق فراہم کیے۔ ان سائنسی کاوشوں کے ذریعے مسلمانوں نے دنیا کو نہ صرف جغرافیائی علم کی روشنی دی بلکہ اس علم کے ذریعے مواصلات کے نظام کو بھی بہتر بنایا۔ ان مسلم سائنسدانوں کی بدولت ہم آج بھی جغرافیہ اور نقشہ سازی کے اصولوں کا استعمال کرتے ہیں، جو کہ مسلمانوں کی علمی وراثت کا ایک قیمتی

حصہ ہے۔ نامور مغربی مورخ ہٹی (Philip K. Hitti) نے اِن مسلمان ماہرینِ فن کی علمی خدمات کے اِعتراف میں لکھا ہے:

> The bulk of this scientific material, whether astronomical, astrological or geographical, penetrated the west through Spanish and Sicilian channels.[1]

''اُس سائنسی مواد کا زیادہ تر حصہ، خواہ وہ 'علمِ فلکیات' (اَجرامِ سماوِی کا علم) کے مطالعہ پر مبنی ہو یا 'علم نجوم' (پیش بینی) کے مطالعہ یا 'علم جغرافیہ' پر مبنی ہو، اندلس اور (اٹلی کے جنوبی ساحل پر واقع جزیرے) سسلی کے ذریعے عالمِ مغرب میں داخل ہوا۔''

علمِ جغرافیہ (Geography) کے میدان میں مسلمانوں کا دورِ قرونِ وسطیٰ ایک سنہری دور شمار ہوتا ہے، جب مسلم جغرافیہ دانوں نے اس علم میں ایسی مہارت حاصل کی کہ ان کا فن عالمی شہرت اور پذیرائی کا حامل بن گیا۔ ان کی تحقیق اور تحقیقاتی کام نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ مغربی دنیا میں بھی جغرافیہ کے شعبے میں نمایاں اثرات چھوڑ گئے۔ ۱۳۳۱ء میں چین کا سرکاری نقشہ (official map) بھی مسلمان جغرافیہ دانوں نے ہی تیار کیا تھا،[2] جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے دور کے سب سے بہترین جغرافیائی محقق تھے۔ ان کا جغرافیائی علم نہ صرف عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا بلکہ ان کی تیار کردہ نقشہ سازی کے اصول آج بھی جغرافیائی تحقیق کے بنیادی ستونوں میں شامل ہیں۔

مسلمانوں کی تجارتی سرگرمیاں اور عالمی روابط کا ایک اور اہم ثبوت وہ ہزارہا اسلامی سکے ہیں جو جزیرہ نمائے سکینڈے نیویا (Scandinavia)، فن لینڈ (Finland)، کازن (Kazan) اور روس (Russia) کے دور دراز علاقوں میں کھدائیوں کے دوران دریافت ہوئے ہیں۔ یہ سکے مسلمانوں کے اوائلِ اسلام میں کیے جانے والے تجارتی سفروں اور بین الاقوامی روابط کی عکاسی کرتے ہیں، جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ مسلمان نہ صرف جغرافیائی علم میں مہارت رکھتے تھے بلکہ عالمی سطح پر تجارتی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھے۔

---

1 Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, p. 387.

2 Validi, Ahmet Zaki, "Islam and the Science of Geography", Translated by Pickthal, *Islamic Culture*, vol 8: p.514, Oct. 1934.

اس کے علاوہ، معروف جغرافیہ دان اور ملاح، واسکو ڈے گاما (Vasco de Gama) کے پائلٹ ابن ماجد نے مسلمانوں میں اُس دور میں قطب نما (compass) کے استعمال کی خبر دی، جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ مسلمان نہ صرف جہاز رانی اور بحری سفر میں ماہر تھے بلکہ انہوں نے اپنے دور کے جدید ترین نیویگیشن آلات کو بخوبی استعمال کیا۔ ابن ماجد کی تصانیف نے عالمی جہاز رانی کے شعبے میں ایک نیا باب کھولا، اور ان کی تحقیق سے جدید نیویگیشن کے اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملی۔[1]

مسلمان سائنسدانوں کی جغرافیائی تحقیق اور نیویگیشن میں استعمال ہونے والی اصطلاحات نے جدید علم میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ آج بھی ہم بہت سی جدید جغرافیائی اصطلاحات میں مسلمانوں کے دورِ وسطیٰ کی علمی وراثت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کی جغرافیائی تحقیقات نے نہ صرف اسلامی دنیا میں بلکہ دنیا بھر میں جغرافیہ کے علم کو فروغ دیا اور اس کی بنیاد رکھی۔ یہ تمام حقائق اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے عہد میں علمِ جغرافیہ، نقشہ سازی، اور نیویگیشن کے شعبے میں جو غیر معمولی کام کیا وہ آج بھی سائنسی دنیا کے لیے ایک قیمتی ورثہ ہے۔ مسلمان جغرافیہ دانوں کا یہ علمی سرمایہ نہ صرف ماضی کا حصہ ہے بلکہ یہ مستقبل میں بھی جغرافیائی تحقیق کے لیے ایک رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

---

1 Farhat H. Hussain, *The Birth of Muslim Coinage*, pp. 27-32.

(۹)

مگر وہ عِلم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی

۱۱۔ علم کے موتی

مسلمانوں کی علمی زبوں حالی اور ان کے عظیم علمی سرمائے کی مغربی کتب خانوں میں موجودگی وہ موضوعات ہیں جن پر علامہ اقبال ہمیشہ غمگین اور غم سے بھری ہوئی نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کو اس بات کا شدید دکھ اور تاسف تھا کہ مسلمان جس علمی ورثے کے مالک تھے، آج کی نسل نہ صرف اس سے محروم ہے بلکہ انہیں اس بات کا بھی شعور نہیں ہے کہ یہ عظیم سرمایہ اغیار نے لوٹ کر اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ علامہ اقبال اس بات سے شدید طور پر متاثر ہوئے اور انہیں ہمیشہ یہ فکر لاحق رہی کہ مسلمانوں کا علمی خزانہ مغربی دُنیا میں محفوظ ہے، جبکہ مسلمان خود اس سے بے خبر اور بے پرواہ ہیں۔

یورپ میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے، علامہ اقبال نے اپنی آنکھوں سے کئی حقائق دیکھے اور وہاں کی لائبریریوں اور کتب خانوں میں مسلمانوں کے علمی آثار کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مغرب کے اہلِ علم کس طرح مسلمانوں کے علمی ورثے سے استفادہ کر رہے ہیں اور وہ اس علم کی بدولت نہ صرف ترقی کی راہ پر گامزن ہیں بلکہ اسے جدید علم کے طور پر پیش بھی کر رہے ہیں۔ اس حقیقت نے علامہ اقبال کو جھنجھوڑا اور ان کے دل میں ایک غم اور درد کی لہر دوڑ گئی۔

اپنی نظموں اور نثر میں علامہ اقبال نے بار بار اس حقیقت کا تذکرہ کیا، اور جہاں بھی انہیں موقع ملا، انہوں نے اپنی قوم کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال کا کہنا تھا کہ جب میں اپنے آباواجداد کے اس علمی ورثے کو مغرب کے کتب خانوں میں دیکھتا

ہوں، جہاں وہ اس علم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور ہم نہ صرف اس سے محروم ہیں بلکہ اس سے غافل بھی ہیں، تو یہ منظر میرے دل کو چاک کر دیتا ہے۔ یہ منظر علامہ اقبال کی شاعری اور فکر میں ایک عمیق دکھ اور غم کی صورت میں ظاہر ہوا، اور وہ اپنی قوم کو بیدار کرنے کے لیے مسلسل اس پیغام کو دہراتے رہے کہ مسلمانوں کو اپنے اس گم شدہ علمی ورثے کو دوبارہ حاصل کرنا ہو گا۔

علامہ اقبال کی یہ فکر آج بھی ہمارے لیے ایک اہم پیغام ہے کہ ہمیں اپنے علمی سرمائے کی قدر کرنی چاہیے اور اس کا از سرِ نو جائزہ لے کر اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ ہم اپنی اصل عظمت اور مقام کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی لکھتے ہیں:

> لیکن جب ہم یورپ میں علم کے موتی یعنی اپنے اسلاف کی کتابیں دیکھتے ہیں تو ہمارا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، بڑا دکھ ہوتا ہے۔ آج سے تین چار صدیاں پہلے یورپ ازمنہ مظلمہ (Dark Ages) میں ڈوبا ہوا تھا، وہاں جہالت کا دور دورہ تھا لیکن پھر اہل یورپ ہم مسلمانوں کی عظیم کتب لے گئے۔ (انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے دوران ہمارے کتب خانے یورپ منتقل کر لیے تھے جن کی کثیر تعداد اب لندن کی "انڈیا آفس لائبریری" اور برٹش میوزیم میں محفوظ ہے)۔[1]

اگر ہم مغرب کی لائبریریوں اور کتب خانوں میں موجود مسلمانوں کے علمی اثرات اور تصانیف کا جائزہ لیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے علم کے ہر شعبے میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں، اور یہی کامیابیاں بعد میں مغرب کی علمی ترقی کی بنیاد بنی۔ علمِ ہیئت و فلکیات میں مسلمانوں کا کردار انتہائی اہم اور ناقابلِ فراموش ہے۔ انہوں نے یونانی فلسفے کے پیچیدہ نظریات سے باہر آ کر علمِ فلکیات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا۔ آج بھی مغربی زبانوں میں بے شمار اَجرامِ سماوی کے نام عربی میں استعمال ہو رہے ہیں، کیونکہ یہ تمام مسلم

---

[1] یزدانی، ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید، شرح بانگ درا (لغت و تشریح)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۱۶ - ۳۱۷۔

ماہرینِ فلکیات کی دریافتیں ہیں جو اس علم کی ترقی میں سنگ میل ثابت ہوئیں۔ معروف مورخ فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) لکھتا ہے:

> Not only are most of the star ....names in European languages of Arabic origins .... but a numbers of technical terms .... are likewise of Arabic etymology and testify to the rich legacy of Islam to Christian Europe. [1]

"یورپ کی زبانوں میں نہ صرف بہت سے ستاروں کے نام عربی الاصل (عربی زبان سے نکلنے والے) ہیں بلکہ لاتعداد اِصطلاحات بھی داخل کی گئی ہیں جو یورپ پر اِسلام کی بھرپور وراثت کی مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہیں۔"

مسلمانوں کی علم الفلکیات میں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ول ڈیورانٹ (Will Durant) لکھتا ہے:

> .... The Caliph al-Mamun engaged a staff of astronomers to make observations and records, to test the findings of Ptolemy, and to study the spots on the sun. Taking for granted the sphericity of the earth, they measured a terrestrial degree by simultaneously taking the position of the sun from both Palmyra and the plain of Sinjar; their measurement gave 56.66 miles--half a mile more than our present calculation; and from their results they estimated the earth's circumference to approximate 20,000 miles. [2]

"..... یہاں خلیفہ مامون نے ماہرین فلکیات کو متعین کیا کہ وہ تحقیق و تدوین کریں، بطلیموس کے نتائج کو پرکھیں اور سورج کے دھبوں کا مطالعہ کریں۔ زمین کو گول تصور کرتے ہوئے انہوں نے زمین کی گولائی کے درجے کی پیائش ۵۶.۶۶ میل بیان کی۔ اس کے لئے انہوں نے پالیمرا اور سنجر کے میدان سے سورج کے مقام کا تعین کیا۔ ان کی پیائش ہماری موجودہ پیائش سے صرف نصف ایک میل زیادہ ہے۔ اپنے ان نتائج سے انہوں نے زمین کا محیط تقریباً بیس ہزار (۲۰۰۰۰) میل بیان کیا۔"

---

1 Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, pp. 568-573.

2 Will Durant, *The Age of Faith*, p. 242.

(۱۰)

ثُریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

۱۲۔ ثُریّا

علامہ اقبال مسلم نوجوان کو متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب سے مسلمان زوال کا شکار ہوئے ہیں، وہ آسمان کی بلندیاں چھونے کے بعد پاتال کی پستیوں میں گر گئے ہیں۔ اس زوال کی سب سے بڑی وجہ ان کی علمی پسماندگی، سیاسی ضعف، کردار کی کمزوری اور اقتصادی میدان میں بے دست و پائی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عظیم ماضی کو بھلا کر دنیاوی ترقی کی جانب کم توجہ دی، جس کے نتیجے میں وہ عالمی سیاست اور معاشی معاملات میں اپنے فیصلوں کو درست طریقے سے نہیں لے سکے۔ علامہ اقبال کے مطابق، مسلمانوں کا عروج صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی علمی صلاحیتوں کو دوبارہ فروغ دیں، اپنے سیاسی نظام کو مضبوط کریں اور اپنے کردار کو بہتر بنائیں۔

تاریخ کے صفحات پر درج ہونے والی تفصیلات علامہ اقبال کے دردِ دل کی عکاسی کرتی ہیں اور یہ ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ "ثریا سے زمیں تک کا سفر" جو مسلمانوں نے کیا، وہ ایک بدترین زوال کی کہانی ہے۔ ان تفصیلات کے ذریعے علامہ اقبال نے مسلمانوں کے اس بدترین حال کی نشاندہی کی ہے جس میں وہ کبھی اپنی شان و شوکت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، لیکن وقت کے ساتھ ان کے اندرونی اور بیرونی عوامل کی وجہ سے وہ پاتال کی پستیوں تک جا پہنچے۔ علامہ اقبال نے اس زوال کے اسباب کو نہ صرف علمی پسماندگی، سیاسی جمود، اقتصادی مشکلات، اور عالمی سیاست میں کمزوری کے طور پر بیان کیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کی تقدیر کا یہ زوال ان کے اپنے اندر کی غفلت، سستی، اور عدم اتحاد کا نتیجہ تھا۔ ان

تفصیلات کے ذریعے اقبال نے اپنی قوم کو جگانے کی کوشش کی، تاکہ وہ اپنے ماضی کی عظمت کو واپس حاصل کرنے کے لئے صحیح راستہ اختیار کریں۔

افتخار حسین برصغیر میں انہی حالات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ واقعہ اٹھارویں صدی کا ہے۔۔۔۔ کبھی بادشاہ نے وزیر کو قتل کر دیا، کبھی وزیر نے بادشاہ کو تہہ تیغ کر دیا۔ کبھی کسی شہزادے کو ساری عمر کے لیے زندان میں ڈال دیا گیا، کبھی شاہی خاندان کے کسی نوجوان کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن تاریخ میں غالباً سب سے پہلی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ ایک برسرِ اقتدار شہنشاہ کو خود اس کے محل میں اس کی اولاد اور خاندان کے سامنے انسانیت کے ہولناک ترین جرائیم کا نشانہ بنا کر اس کی آنکھیں نکال لی گئیں اور اسے اندھا کر کے زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ یہ ظلم ایک مسلمان نے ایک مسلمان شہنشاہ پر کیا اور افسوس یہ ہے کہ اسلام کے نام پر کیا۔ اس بربریت کی مثال دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کہیں ملے۔

وہ سنگدل اور ظالم شخص، جس نے اس بربریت کا مظاہر کیا، غلام قادر روہیلہ تھا اور وہ شہنشاہ جو اس بربریت کا شکار ہوا شاہ عالم ثانی تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مغل شہنشاہ شاہ عالم کا حقیقی اقتدار بہت محدود تھا۔ مشہور ہے کہ "سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم" لیکن اس کے باوجود شہنشاہ مغلیہ کا احترام تقریباً سارے ہندوستان میں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل لارڈ ویلزلی (Wellesley) نے ایک مقام پر لکھا ہے:

"حقیقی اقتدار سے محروم ہو جانے کے باوجود ہندوستان کی تمام ریاستیں اور عوام کا ہر طبقہ شاہ عالم کے برائے نام اقتدار کو تسلیم کرتا ہے۔"

واقعہ یہ تھا کہ ہندوستان اور خصوصاً شمالی ہند کے سب فرماں روا (مسلمان اور ہندو) مغل شہنشاہ کا نہ صرف احترام کرتے تھے بلکہ جب کوئی نیا فرد تخت پر بیٹھتا تھا تو وہ اپنے اقتدار کے قانونی جواز کی سند مغل شہنشاہ سے طلب کرتا تھا اور جب بھی کوئی حکمران دربار مغلیہ میں حاضر ہوتا تھا تو وہی آداب شاہی ملحوظ رکھتا تھا جو صدیوں سے شاہان مغلیہ کے دربار میں باریابی کے لیے مخصوص اور ضروری تھے۔ انگریز گورنر جنرلوں نے بھی ان آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اگر کبھی کسی انگریز جنرل یا افسر سے اس باب میں کوئی سہو ہوا تو اس کی سختی سے سرزنش کی گئی۔

شاہ عالم پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ شمالی ہند کے حکمران اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ احترام قائم تھا لیکن کوئی اسے مدد دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ فوجوں کو عرصے سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ نادر شاہ کے حملے سے دلی لٹ چکی تھی۔ احمد شاہ ابدالی جسے ایک عظیم مذہبی شخصیت نے ہندوستان میں ''اسلامی سلطنت'' قائم کرنے کی دعوت دی تھی، کئی بار ہندوستان آچکا تھا۔ ''اسلامی سلطنت'' تو قائم نہ ہو سکی لیکن ہر مرتبہ احمد شاہ ابدالی کی فوج دلی اور شمالی ہندوستان کو تاراج کر کے واپس اپنے وطن جاتی رہی۔ عوام غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ عزت اور آبرو کے ساتھ محض زندہ رہنا چاہتے تھے لیکن اقتدار کی خانہ جنگی نے عوام کو اس حق سے بھی محروم کر دیا تھا۔ ایسے میں تاج مغلیہ کو قائم رکھنے کے لیے صرف ایک حکمران شاہ عالم کے ساتھ تھا۔ یہ حکمران مہاراجہ سندھیا تھا جو مرہٹہ تھا۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ وہ مرہٹے جنھوں نے اورنگ زیب کے دور میں اقتدار حاصل کیا تھا اور جو تاج مغلیہ کو روند ڈالنا چاہتے تھے، ان میں سے ایک حکمران یعنی مہاراجہ سندھیا تاج مغلیہ کو قائم رکھنے میں شاہ عالم کی مدد کر رہا تھا۔ شاہ عالم متعدد بار انگریزوں کی طرف سے مدد کی پیش کش کو ٹھکرا چکا تھا لیکن جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا، قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مہاراجہ سندھیا شاہ عالم کی مدد کے لیے اکثر دلی کے آس پاس رہا کرتا تھا لیکن ۱۷۸۸ء میں وہ ایک مہم کے سلسلے میں صرف دو ماہ کے لیے آگرے چلا گیا جہاں اسے چند دشمنوں کی سرکوبی کرنا تھی۔ مگر اس دو ماہ کے عرصے میں شاہ عالم اور خاندان شاہی پر قیامت گزر گئی۔

غلام قادر روہیلہ، شاہ عالم کا اس لیے دشمن ہو گیا تھا کہ شاہ عالم نے اس کے والد ضابطہ خاں کو عدول حکمی کی بنا پر اس کے عہدے سے محروم کر دیا تھا۔ یہ ایک سازش کی داستان ہے جسے اس موقع پر بیان کرنا ضروری نہیں۔ غلام قادر اپنے والد کی معزولی کا انتقام لینا چاہتا تھا اور اس کے علاوہ یہ بھی چاہتا تھا کہ لٹی ہوئی سلطنت کے سربراہ کے محل میں جو مال و دولت بھی مل سکے اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ لیکن یہ ہوتا آیا ہے کہ اقتدار کے دیوانوں کے اصل مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں۔ چنانچہ غلام قادر نے یہ حیلہ تراشا کہ اس کا مقصد شاہ عالم کو ہٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ چنانچہ ''اسلام کی خدمت'' کے اس جذبے سے سرشار ہو کر غلام قادر نے اپنے دوست اسماعیل کے ساتھ فوج اور سامان جنگ سے لیس ہو کر دلی پر چڑھائی کر دی۔ غلام قادر کی فوجیں یکم جولائی

۱۷۸۸ء کو دلی کے گرد و نواح میں پہنچیں اور انھوں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کی بجائے لوٹ مار، قتل و غارت گری شروع کر دی۔ مہاراجہ سندھیا نے خود مصائب میں مبتلا ہونے کے باجود اپنی افواج کا کچھ حصہ شاہ عالم کی مدد کے لیے بھیجا۔

شاہ عالم کی فوج نے افلاس زدہ ہونے کے باوجود مقابلہ کیا لیکن اسے کیا کیجیے کہ خود شاہ عالم کے معتمد اعلیٰ افسران غلام قادر سے مل گئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف شاہی افواج کو غلط راستہ دکھایا بلکہ سندھیا کی بھیجی ہوئی فوج کی بھی حوصلہ افزائی نہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھیا کی فوج نے دلی سے کوچ کیا اور شاہ عالم بے یار و مدد گار رہ گیا۔

غلام قادر کی فوجوں نے چار ہفتے تک دلی اور اطراف میں قتل و غارت کیا جس کی مثال صرف احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے دوران ہی مل سکتی ہے۔ آخر کار ۳۰ جولائی کو غلام قادر محل شاہی کے دروازے پر آیا اور درخواست کی کہ وہ شہنشاہ کی خدمت میں بازیابی کا خواہش مند ہے۔ غلام قادر نے قرآن کریم کی قسم کھائی کہ اس کا مقصد صرف مغل شہنشاہ سے اظہار وفاداری ہے۔ محل شاہی کے پاسبانوں نے شاہ عالم کو سمجھانے کی کوشش کی یہ دھوکہ ہے، فریب ہے۔ غلام قادر کو محل کے اندر نہ آنے دیا جائے، لیکن شاہ عالم کے بعض مشیر ایسے بھی تھے جنھوں نے یہ مشورہ دیا کہ غلام قادر نے قرآن حکیم کی قسم کھائی ہے لہٰذا اس پر اعتبار نہ کرنا اسلامی نظریات کے خلاف ہو گا اس لیے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔ معلوم نہیں ان مشیروں کی رائے ان کے بھولپن پر مبنی تھی یا سازش پر، لیکن شاہ عالم نے اس رائے پر عم کیا اور غلام قادر کو اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ جوں ہی محل کے دروازے کھل گئے، نہ صرف غلام قادر داخل ہوا بلکہ اس کے ساتھ دو ہزار سپاہی بھی شاہی محل میں داخل ہو گئے۔

غلام قادر کی فوج کے محل میں داخل ہونے پر کہرام مچ گیا۔ شہزادہ اکبر نے کہا کہ یا تو مجھے لڑ کر مر جانے کی اجازت دیجیے ورنہ میں خود کشی کر لوں گا۔ شاہ عالم نے بہ مشکل اسے روکا اور کہا کہ مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ غلام قادر دربار عام سے ہوتا ہوا دربار خاص میں پہنچا اور شہنشاہ سے مطالبہ کیا کہ اسے روپے کی ضرورت ہے لہٰذا جتنی دولت محل میں ہے وہ اسے دے دی جائے۔ شہنشاہ نے کہا کہ میرے پاس جو کچھ تھا وہ میں دے چکا ہوں اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ غلام قادر اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ چنانچہ

شہنشاہ کو ایک مسجد میں قید کر دیا گیا اور محل کی تلاشی کا کام شروع کر دیا گیا۔ دوسرے دن شہنشاہ کو مسجد سے ہٹا کر محل کے اس حصے میں کر دیا گیا جہاں مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔ غلام قادر کے سپاہیوں نے اب محل کے حرم کی تلاشی شروع کی۔ محل کے فرش، دیواروں اور چھتوں کو توڑا گیا لیکن اس میں وہ خزانہ نہ ملا جس کی غلام قادر کو تلاش تھی۔ شہنشاہ کی بیگمات اور کنیزوں کی تلاشی لی گئی لیکن چند زیورات کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ اگلے دن محل کے در و دیوار چیخ و پکار سے گونج اٹھے۔ شہنشاہ کے ملازمین کو ہولناک اذیتیں دی جارہی تھیں۔ انھیں آگ پر الٹا لٹکایا جارہا تھا۔ ان کے ہاتھوں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جارہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود افلاس زدہ محل میں وہ خزانہ نہ ملا جس کی غلام قادر کو تلاش تھی۔ آخر جب اذیت رسانی کے تمام طریقے ناکام ہو گئے تو غلام قادر نے شہنشاہ سے کہا کہ وہ جس طرح بھی ہو خزانے کا پتہ بتائے۔ شاہ عالم نے کہا تم نے سارا محل دیکھ لیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ خزانہ میرے پیٹ میں ہے؟ غلام قادر نے کہا اگر ضرورت ہوئی تو حقیقت کی تلاش میں خنجر کو بھی استعمال کرنا پڑے گا اور آخر کار غلام قادر نے شہنشاہ کے جسم پر خنجر بھی استعمال کیا جس کے محل میں وہ قرآن حکیم کی قسم کھا کر داخل ہوا تھا۔ غلام قادر نے خنجر کیونکر استعمال کیا اس کی مختصر داستان مشہور انگریز مصنف مائیکل ایڈورڈز نے اس طرح بیان کی ہے:

> On 10 August, tired of Shah Alam's constant complaints, Ghulam turned to his bodyguard. 'Throw this babbler down and blind him!' The ex-emperor was instantly struck to the ground and needles were driven into his eyes. Ghulam asked the moaning Shah Alam whether he could see anything, and he replied: 'Nothing but the holy Koran between you and me.'
>
> Next day, Ghulam sent for a court painter and ordered him to record the scene as he and one of his commanders extracted Shah Alam's eyeballs with a dagger.[1]

۱۰/ اگست کے دن جب غلام قادر، شاہ عالم کے بیان سے مطمئن نہیں ہوا تو اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کمینے کو زمین پر گرا دو اور اسے اندھا کر دو۔ چنانچہ مغل شہنشاہ ٹھوکر

---

[1] Michael Edwardes, *King of the Wordl – The Life and Times of Shah Alam Emperor of Hindustan*, Secker & Warburg, London, 1970, p. 202.

مار کر تخت سے گرایا گیا اور اس کی آنکھوں میں سوئیاں ڈالی گئیں۔ شہنشاہ درد و کرب سے چیختا رہا۔ آخر جب سوئیاں اس کی آنکھوں میں اچھی طرح پیوستہ ہو گئیں تو غلام قادر نے شہنشاہ سے پوچھا:

"کہو اب تمہیں کچھ دکھائی دیتا ہے؟"

شہنشاہ نے جواب دیا: "ہاں مجھے، تمہارے اور اپنے درمیان قرآن دکھائی دیتا ہے۔"

دوسرے دن غلام قادر نے ایک درباری مصور کو بلا بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ ایک منظر کی تصویر کشی کرے۔ وہ منظر کیا تھا؟ غلام قادر نے منظر یہ پیش کیا کہ اپنے ایک کمانڈر سے کہا کہ وہ خنجر کے ذریعے شاہ عالم کی آنکھیں نکالے۔ چنانچہ خنجر کے ذریعے مغل شہنشاہ کی دونوں آنکھیں نکال دی گئیں۔

گزشتہ سطور میں خاندان مغلیہ کے دور زوال کے بیان میں غلام قادر روہیلہ کا ذکر گیا کہ وہ قرآن کی قسم کھا کر مغل شہنشاہ کے محل میں داخل ہوا اور اس کے بعد قسم توڑ کر اس نے شہنشاہ شاہ عالم ثانی اور اس کے خاندان پر مظالم توڑے اور شہنشاہ کی آنکھیں نکال لیں۔

غلام قادر روہیلہ نے شاہی محل میں جو مظالم کیے ان کی داستان خاصی طویل ہے جس کی تفصیلات بیان کرنے سے قارئین کو صدمہ ہو گا۔ اس لیے میں ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ صرف ایک واقعے کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں تا کہ اندازہ ہو جائے کہ مسلمانوں کے اس دور انحطاط میں بعض صاحب اقتدار افراد کا معیار اخلاق کن پستیوں میں چلا گیا تھا۔

شہزادوں اور بادشاہوں پر مظالم، قید و بند، قتل وغیرہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یہ روش عام ہو چکی تھی کہ آنکھیں نکالنا لاکھ اذیت ناک سہی لیکن یہ بھی ایک ایسی سزا تھی جسے اس تاریک دور میں باقاعدہ "جائز" تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن ایک ظلم ایسا تھا جسے اس دور میں بھی کسی صورت میں جائز تسلی نہیں کیا جاتا تھا اور وہ یہ ظلم تھا کہ خاندان شاہی کی خواتین کی بے عزت کی جائے۔ خواتین کی عزت و آبرو کو ہندوستان کے سب حکمران مسلمان، ہندو، سکھ تسلیم کرتے تھے۔ حتی کہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے دوران بھی خاندان شاہی کی خواتین کی عزت و آبرو کی اچھی طرح حفاظت کی جاتی تھی اور کسی نے حرم شاہی کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرات نہیں کی تھی۔ اس

کی وجہ یہ تھی کہ اس دور انحطاط میں قوم کے اخلاق پس ہو گئے تھے لیکن اس قدر پست نہیں ہوئے تھے کہ ناموس شاہی پر ہاتھ ڈالنا برداشت کیا جا سکے۔ ایک قدیم روایت تھی جس کا احترام کیا جاتا تھا۔ وہ روایت یہ تھی کہ شاہی حرم کی خواتین پوری قوم کا ناموس ہیں۔ اگر ان خواتین کی بے عزتی کی جائے تو دراصل بے عزتی ان افراد کی ہوتی ہے جو اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس طرح پوری قوم بے عزت ہو جاتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مغل شہنشاہ کی آنکھیں نکالنا بھی کافی نہ سمجھا گیا اور اس کے بعد غلام قادر روہیلہ نے اخلاق پستی کا وہ مظاہرہ کیا جس کی مثال مسلمان بادشاہوں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ مائیکل ایڈورڈز نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

> One day he had brought to him two young princesses whom he had been told were very beautiful. When they arrived, suitably veiled, he had them stripped and fondled their breasts and thighs, to the accompaniment of obscene remarks from his companions. Before matters could go any further, the princesses were rescued by one of Ghulam's Sikh supporters, who threatened to leave Delhi, taking his troops with him, if the princesses were molested again.[1]

"ایک دن غلام قادر نے دو شہزادیوں کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا جن کے حسن و جمال کے بارے میں اس نے بہت تعریف سنی تھی۔ شہزادیاں مناسب لباس میں بانقاب حاضر ہوئیں۔ مگر اس نے شہزادیوں کو برہنہ کیا اور ان کی چھاتیوں اور رانوں پر دست درازی کی ..... لیکن اس سے پہلے کہ معاملہ آگے بڑھتا، مغل شہزادیوں کو ایک سکھ سردار نے اس ظالم سے بچایا۔ یہ سکھ سردار غلام قادر کا معاون و مددگار تھا۔ اس نے کہا کہ اگر شہزادیوں پر دست درازی کی گئی تو میں اپنی فوج لے کر دہلی سے چلا جاؤں گا۔"

یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ مائیکل ایڈورڈز نے جن ماخذ سے اپنی کتاب مرتب کی ہے وہ کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے کافی وقیع ہیں۔ مصنف نے انگریزی، مرہٹی اور فرانسیسی ماخذ کے علاوہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فارسی ماخذ سے بھی استفادہ کیا ہے جن میں اخبارات،

---

1 Michael Edwardes, *King of the Wordl – The Life and Times of Shah Alam Emperor of Hindustan*, Secker & Warburg, London, 1970, p. 204.

تاریخ، احمد شاہی، تاریخ عالمگیر ثانی خیر الدین کا "عبرت نامہ" اور غلام حسین طباطبائی کی "سیرت المتاخرین" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور فکر انگیز ماخذ علامہ اقبال کے وہ اشعار ہیں جو انھوں نے اس المناک واقعے سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔ علامہ اقبال کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

رُہیلہ کس قدر ظالم، جفا جُو، کینہ پرور تھا
نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے
یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے
بھلا تعمیل اس فرمانِ غیرت کُش کی ممکن تھی!
شہنشاہی حرم کی نازنینانِ سمن بر سے
بنایا آہ! سامانِ طرب بیدرد نے اُن کو
نہاں تھا حُسن جن کا چشمِ مہر و ماہ و اختر سے
لرزتے تھے دلِ نازک، قدم مجبورِ جُنبش تھے
رواں دریائے خُوں، شہزادیوں کے دیدۂ تر سے[1]

مذکورہ تفصیل سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اٹھارویں صدی میں مسلمان حکمرانوں کے ظلم و ستم اور ان کے اخلاقی زوال کا حدِ کمال تک پہنچنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس دور میں مسلمان حکمران اپنے اقتدار کے مستحکم ہونے کے بجائے جمود، غفلت اور بدعنوانی کا شکار ہو گئے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی حکمرانی کے اصول و ضوابط میں کوئی سنجیدہ تبدیلی نہ آئی۔ اس اخلاقی گراوٹ اور حکومتی بدعنوانیوں کے باعث وہ زوال کی طرف گامزن ہو گئے، اور وہی کچھ ہوا جو تاریخ میں کئی مرتبہ دہرایا جا چکا تھا۔

---

[1] علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۴۶۔

تاریخ نے کروٹ لی اور صورت حال یک دم بدل گئی۔ دو سو سال تک قائم رہنے والی مغلیہ سلطنت کا تخت و تاج متزلزل ہو گیا۔ مغل شہنشاہ، جو عمر بھر انگریزوں کے خلاف لڑنے کی کوشش کرتا رہا، آخر کار اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کی غداری اور ظلم کا شکار ہو کر بے بس ہو گیا۔ اس نے اپنے اقتدار کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے انگریزوں کے اقتدار میں پناہ لی۔ اس طرح وہ اپنے خاندان کی عزت اور شاہی حرم کی خواتین کی آبرو کی حفاظت کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں مغل سلطنت کے اختتام کی ابتدا ہوئی، اور اس زوال کی ایک بڑی وجہ داخلی خلفشار اور اخلاقی پستی تھی جس کا سامنا اس سلطنت کو اپنے آخری ایام میں کرنا پڑا۔ یہ واقعہ تاریخ کی ایک غمگین حقیقت کی طرح مسلمانوں کے لیے ایک سبق بن کر سامنے آیا کہ جب تک حکمران اپنی ذمہ داریوں اور اخلاقی اقدار کو صحیح طور پر نہ اپنائیں، اس طرح کے زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انگریز فوجوں کے کمانڈر جنرل لیک کا، حکم شاہی کے تحت، دلی میں استقبال کیا گیا۔ جب جنرل لیک دربار شاہی میں حاضر ہوا، اس وقت کا منظر ایک انگریز نے یوں بیان کیا ہے:

> On 16 September, Lake set out for an audience with Shah Alam. According to the arrangements, Prince Akbar was to go to Lake's camp outside the walls at noon, but because of some delay it was three hours later before the prince arrived. After a number of ceremonies, the prince remounted his elephant and the cavalcade moved off, reaching the palace only at sunset. The streets outside the palace were crowded with people, which made passage difficult, but finally the commander-in-chief was led into the Hall of Private Audience. It was lit by flickering torches. And there, as one of Lake's party wrote later, the emperor, 'the descendant of the great Akbar and the victorious Aurangzeb, was found, an object of pity, blind and aged, stripped of authority, and reduced to poverty, seated under a tattered canopy, the fragment of regal state, and the mockery of human pride'.

> The flickering torches, the poverty, even the tattered canopy may have been a carefully considered pretence, the stage-set of a drama which had been enacted many times before. But it was, in fact, the last scene in the last act of the Mughal empire, which thereafter disappeared into the shadows. [1]

"ایوان شاہی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ یہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھے کیونکہ ان کے شہنشاہ کو بے عزتی اور قید و بند سے رہائی دلائی جا رہی تھی۔ آخر کار کمانڈر انچیف کو دربار شاہی میں پیش کیا گیا۔ اس (لارڈ لیک) نے دیکھا کہ بد قسمت بزرگ شہنشاہ آلام ضعیفی سے نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ وہ مفلس اور نابینا ہو چکا تھا۔ وہ ایک شکستہ شامیانے کے تلے بیٹھا ہوا تھا جو اس کی عظمت رفتہ کی یاد دلا رہا تھا اور زبان حال سے ان مصائب پر نوحہ کناں تھا جو امتداد زمانہ سے آشکارا ہو چکے تھے۔"

اور اس طرح مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی کی آنکھیں بے نور ہونے کے بعد خانوادہ تیموری کی عظمت کا ٹمٹاتا ہوا چراغ گل بھی ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء تک شاہان مغلیہ بے پناہ تاریکی میں اپنی عظمت رفتہ کی نوحہ خوانی کے لیے باقی رہ گئے۔ [۲]

---

[1] Michael Edwardes, *King of the Wordl – The Life and Times of Shah Alam Emperor of Hindustan*, Secker & Warburg, London, 1970, p. 262-263.

[۲] افتخار حسین، ڈاکٹر آغا، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۰ – ۵۰۔

(۱۱)

غنی! روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

۱۳۔ نور دیدہ اش

یہ غنی کاشمیری کا شعر ہے۔ اصل شعر یوں ہے:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ روشن کرد نور دیدہ اش چشم زلیخا را[1]

علامہ اقبال نے غنی کاشمیری کے اس مشہور شعر کے ذریعے اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے باہمی تعلق کو وضاحت سے بیان کیا ہے، اور اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ مغربی تہذیب اپنی تمام تر ترقی اور علمی پیشرفت کے لیے مسلم تہذیب کی مرہونِ منت ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ مغرب ہماری تہذیبی و علمی کاوشوں اور تحقیقات کے نتیجے میں حاصل ہونے والے علمی ذخائر سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اور انہی ذرائع کی بدولت وہ اپنے شعور کو بیدار کر کے دنیا میں تسخیر کائنات کے راستے پر گامزن ہے، لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ خود مسلم دنیا اور آج کا مسلم نوجوان ان علمی ذخیروں سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہیں۔

علامہ اقبال کی نظر میں یہ ایک بدقسمتی ہے کہ مغرب نے مسلمانوں کے علمی ورثے سے استفادہ کیا اور اپنی ترقی کے راستے کو روشن کیا، جبکہ مسلمان خود اپنے اس علمی خزانے

---

[1] غنی کاشمیری، دیوان غنی کاشمیری، بہ تصحیح و اہتمام کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ، لکھنو، منشی نول کشور پریس، س ن، ص ۷۔

سے بے خبر یا غافل ہیں۔ اقبال اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہوئے مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ جس علم اور تحقیق سے مغرب نے اپنے داخلی اور خارجی نظام کو مضبوط کیا، وہی علم اور تحقیق مسلمانوں کے لیے بھی روشنی کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ آج کا مسلم نوجوان وہی سرمۂ علم سے اپنا شعور بیدار کرے، جو کبھی ان کے آباواجداد کا حصہ تھا، تاکہ وہ دنیا کی امامت کے منصب کو واپس حاصل کر سکیں۔

یہ ایک ایسا پیغام ہے جس میں اقبال مسلم نوجوانوں کو نہ صرف اپنے علمی ورثے کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں، بلکہ انہیں یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ اگر وہ اپنی اس عظیم میراث کو دوبارہ زندہ کرتے ہیں اور اس سے استفادہ کرتے ہیں تو وہ مغرب کی طرح علم اور تحقیق کے ذریعے دنیا میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اقبال کی یہ دعوت ایک نیا عزم اور جذبہ پیدا کرتی ہے تاکہ مسلمان اپنی علمی حقیقت کو سمجھیں اور دنیا میں اپنے شاندار مقام کو دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔

اختتامیہ

علامہ اقبال کی شاعری کا مقصد محض فنی اظہار نہیں تھا بلکہ ان کا پیغام ایک بیداری کی لہر پیدا کرنا تھا، جو ملت اسلامیہ کو اس کی ماضی کی عظمت یاد دلا کر موجودہ پسماندگی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ نظم "خطاب بہ جوانان اسلام" جیسے اشعار میں علامہ اقبال نے خاص طور پر نوجوانوں کو مخاطب کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نوجوان قوم کا مستقبل ہیں اور ان کے عزم و حوصلے سے ہی ملت اسلامیہ کا عروج ممکن ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ان کے سنہری ماضی سے روشناس کرایا اور انہیں اس بات کا شعور دیا کہ وہ کس عظیم تہذیب کے وارث ہیں۔

علامہ اقبال کا پیغام یہ تھا کہ مسلمانوں کا عروج علم، فہم، حکمت، اور اخلاقی اقدار کی بدولت تھا، نہ کہ صرف ظاہری طاقت و حکمرانی میں۔ انہوں نے نوجوانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ نہ صرف اپنی جسمانی قوت پر توجہ دیں بلکہ اپنی فکری، ذہنی، اور اخلاقی قوتوں کو بھی مستحکم کریں تاکہ وہ ایک مرتبہ پھر اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اقبال کا پیغام صرف ماضی کی یاد دلانے تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ نوجوانوں سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ اپنے عہد کے مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے اپنی قوم کی تقدیر بدلنے میں سرگرم عمل ہوں گے۔

"خطاب بہ جوانان اسلام" میں علامہ اقبال کا مقصد نوجوانوں تک یہ پیغام پہنچانا اور انہیں یہ احساس دلانا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچان کر علم و حکمت کی روشنی سے اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ یہ کام نہ صرف انفرادی سطح پر بلکہ اجتماعی سطح پر مسلمانوں کی تقدیر بدلنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے، جیسے اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ہمیں اپنی اصل طاقت اور مقام کا شعور دیا۔ اقبال کی شاعری کی روشنی میں ہم نہ صرف اپنی تہذیبی اور فکری میراث کو

بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں بلکہ ایک نئی تحریک اور وژن کے تحت اپنے ماضی کو جانتے ہوئے اپنی موجودہ حالت کو بہتر بنانے اور ایک روشن مستقبل کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مصادر و مراجع

اردو کتب

۱. ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباءفی طبقات الطباء، مکتبہ الحیاۃ، بیروت، ۱۹۶۵ء

۲. ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت، ۱۹۷۹ء

۳. ابن جوزی، ابو الفرج عبد الرحمن بن علی، صفۃ الصفوۃ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۹۔

۴. ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن عمر، البدایہ والنہایہ، بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۸ء

۵. ابو حنیفہ دینوری، الاخبار الطوال، دار احیاء الکتب العربی، قاہرہ، ۱۹۶۰، ص ۱۲۳

۶. ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، دار المعرفہ، بیروت۔

۷. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۲ء۔

۸. ازدی، ابو اسماعیل محمد بن عبد اللہ بصری، فتوح الشام، بپتست مشن، کلکتہ، ۱۸۵۴ء۔

۹. افتخار حسین، ڈاکٹر آغا، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۱۰. بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، الصحیح، دار القلم، بیروت، ۱۹۸۱ء۔

۱۱. برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۹ء۔

۱۲. بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۳ھ

۱۳. شیرازی، حافظ خواجہ شمس الدین محمد، دیوان حافظ، بہ تصحیح و توضیح پرویز ناتل خانلری، تہران، چاپ اول، ۱۳۶۲ھ۔

۱۴. حبیب احمد صدیقی، مسلمان اور سائنس کی تحقیق، اردو سائنس بورڈ، لاہور

۱۵. شبلی نعمانی، الفاروق، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، س ن

۱۶. عطاء اللہ، شیخ۔ اقبالنامہ: مجموعہ مکاتیب، مکتوب بنام مولوی ظفر احمد صدیقی، اقبال اکادمی

پاکستان، ۲۰۰۸ء۔
۱۷. طبرانی، سلیمان بن احمد، المعجم الکبیر، مکتبہ زہراء، موصل۔
۱۸. طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۷ھ
۱۹. عبد الرحمٰن طارق بی۔ اے، اشارات اقبال، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۸ء۔
۲۰. عسقلانی، احمد بن علی بن حجر، التلخیص الحبیر، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔
۲۱. اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۸ء، ص ۵۳۲۔
۲۲. عمر و اسماعیل محمد، عمر بن عبد العزیز –عدلہ وزہدہ وحکمتہ، وکالۃ الصحافۃ العربیۃ، مصر، ۲۰۲۱ء۔
۲۳. مہری، غلام رسول، مطالب بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۶ء۔
۲۴. غنی کاشمیری، دیوان غنی کاشمیری، بہ تصحیح و اہتمام کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ، لکھنو، منشی نول کشور پریس، س ن، ص ۷۔
۲۵. کلاعی، ابو ربیع سلیمان بن موسیٰ اندلسی، الاکتفاء بما تضمنہ من مغازی رسول اللہ والثلاثۃ الخلفاء، عالم الکتب، بیروت، ۱۴۱۷ھ
۲۶. رومی، جلال الدین مولانا روم، مثنوی معنوی، دفتر دوم، بخش ۳۴، بیت ۸۵۔
۲۷. میر ولی اللہ، لسان الغیب یعنی اردو شرح دیوان حافظ مع مفصل سوانح عمری خاجہ حافظ، نول کشور پریس، بار سوم، ۱۹۲۳ء، ص ۵۷ – ۵۸۔
۲۸. نسیم امروہی، سید قائم رضا، نسیم اللغات اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۷۱۰
۲۹. نسیم امروہی، فرہنگ اقبال، اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۳۸۔
۳۰. واقدی، فتوح الشام، ۱: ۱۷۹؛
۳۱. یزدانی، ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید، شرح بانگ درا (لغت و تشریح)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء۔
۳۲. یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب، تاریخ الیعقوبی، دار صادر، بیروت۔
۳۳. یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح بانگ درا، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ص ۳۳۸، ۳۴۲

English Books

34. Bernard Lewis, *The Arabs in History*, Oxford University Press, London, 1993
35. Briffault, Dr. Robert, *Rational Evolution: The Making of Humanity*, The Macmillan Company, New York, USA, 1930.
36. Bronowski, Jacob, *The Ascent of Man*, Little, Brown and Company, Boston/Toronto, 1973
37. Browne, Edward Granville, *Arabian Medicine*, Cambridge University Press, UK, 1921.
38. Cyrus Abivardi, *Iranian Entomology*, Springer, New York, 2001.
39. David Pingree, "Legacies In Astronomy And Celestial Omens", *The Legacy of Mesopotamia*, Edited by Stephanie Dalley, Oxford University Press, London, 2005.
40. Diepgen, Paul, Die Bedeutung des Mittelalters, in *Essays on the History of Medicine*, London, 1924.
41. Donald Hill, *A History of Engineering in Classical and Medieval Times*, Rutledge, London, 1996.
42. Donald R. Hill, *Islamic Science and Engineering*, Edinburg University Press, Edinburg, 1993.
43. Edward Grant, *The Foundations of Modern Science in the Middle Ages: Their Religious, Institutional and Intellectual Context*, Cambridge University Press, UK, 1996.
44. Farhat H. Hussain, *The Birth of Muslim Coinage*, Heritage Resources, London, 2002.
45. Francesco Gabrieli, *Muhammad and the Conquests of Islam*, Weildenfeld & Nicholson, London, 1968.
46. Gibb, Hamilton A. R., *Mohammedanism: An Historical Survey*, Oxford University Press, UK, 1970.
47. Hitti, Philip K., *History of the Arabs*, Macmillan, London, 2002
48. Hitti, Philip K., *The Arabs: A Short History*, Princeton University Press, New Jersey, USA, 1943.
49. Ivan Van Sertima, "African Presence in Early Europe", *Journal of African Civilization* Ltd. Inc. *Rutgers*, The State University NJ, 2000.
50. John F, Haught, *Science and Religion*, Georgetown University Press, Washington, 2000.

51. Jose Chabas, B.R. Goldstein, *The Alfansine Tables of Toledo* (Archimedes – New Studies in the History and Philosophy of Scenic and Technology), Kluwer Academic Publishers, New York, 2003
52. Manfred Ullmann, *Islamic Medicine*, Edinburg University Press, Edinburg, 1978
53. Margoliouth, D.S. , *Mohammed and the Rise of Islam*, Putnam, NY, London,1905.
54. Mashhad Al-Allaf, *The Essence of Islamic Philosophy*, Islamic Information Center, USA, 2003.
55. Meyerhof, M., "Ibn al-Nafis and his Theory of the Lasser Circulation", *Islamic Science*, 23: 166, June, 1935.
56. Michael Edwardes, *King of the Wordl – The Life and Times of Shah Alam Emperor of Hindustan*, Secker & Warburg, London, 1970.
57. Michael J. O'Dowd, *The History of Medication for Women*, The Parthenon Publishing Group, New York, 2001.
58. Muller, M., Sitzungsberichte der koniglich - bayerischen Akademie der Wissenschaften, Munchen, 2/1863/1-34.
59. Nasr, Seyyed Hossein, *Islamic Science: An Illustrated Study*, Kazi Publishers Incorporated, Lahore, 1995.
60. Prudence Allen, *The Concept of Woman: The Aristotelian Revolution 750BC – AD1250*, William B. Eerdmans Publishing Co., Cambridge, UK, 1985.
61. Retso, Jan, *The Arabs in Antiquity*, Routledge Curzon, London, 2003,
62. Robert L, Benson, Giles Constable, Carol D. Lanham, *Renaissance and Renewal in the Twelfth Century*, University of Toronto Press, Toronto, 1999.
63. Roger M. Savory, *Introduction to Islamic Civilization*, Cambridge University Press, UK, 1976.
64. Salehah Yaacob, "The Dilemma of the Translation Conceptin Islamic Sources", *Global Journal of Human Social Science: G Linguistics & Education*, Volume 19, Issue 6, Version 1.0, Year, 2019, ISSN(e): 2249-460x & ISSN (p): 0975-587X
65. Sarton, George, *A Guide to the History of Science: A First Guide for the Study of the History of Science, with Introductory Essays on Science and Tradition*, Waltham Mass, 1952.
66. Sarton, George, *Introduction to The History of Science*, Carnegie

Institution of Washington, 1931.
67. Schacht, Joseph and Bosworth, C.E., *The Legacy of Islam*, Oxford University Press, London, 1974.
68. Shloms Biderman & Ben-Ami Scharfstein, *Rationality in Question: On Eastern and Western Views of Rationality*, E. J. Brill, New York, 1989.
69. *The Encyclopedia of Islam*, A. J. Brill, Leiden, 1965.
70. Toynbee, A. J., *A Study of History*, Oxford University Press, London, 1956, v.III, p.322.
71. Turner, Howard R., *Science in Medical Islam: An Illustrated Introduction*, University of Texas Press, Austin, 1997.
72. Validi, Ahmet Zaki, "Islam and the Science of Geography", Translated by Pickthal, *Islamic Culture*, vol 8: p.514, Oct. 1934.
73. Watt M. Watt, *The Influence of Islam on Medieval Europe*, Edinburg University Press, Edinburg, 1994.
74. Will Durant, *The Age of Faith*, Simon and Schuster, New York, 1950.